تدبّر

زیرِ نگرانی

مولانا امین احسن اصلاحی

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبّرِ قرآن وحدیث

لاہور۔ پاکستان

سلسلہ نمبر ۲۳ | محرم الحرام ۱۴۰۸ھ | ستمبر ۱۹۸۷ء

تدبّر

فہرستِ مضامین

تذکرہ وتبصرہ

سانحۂ مکۂ مکرمہ ——— خالد مسعود ۳

تدبرِ قرآن

تفسیر سورۂ مائدہ (۲) ——— خالد مسعود ۷

تدبرِ حدیث

نمازوں کے اوقات (۱) ——— امین احسن اصلاحی / ماجد خاور ۱۲

افاداتِ فراہی

حکمتِ قرآن (۱) ——— خالد مسعود ۲۰

مقالات

سائنس کا صحیح طریقِ کار ——— خالد مسعود ۲۸

تعقب ——— محبوب سبحانی ۳۵

مجلسِ ترتیب

- خالد مسعود (مدیر)
- عبد اللہ غلام احمد
- ماجد خاور
- محبوب سبحانی

ناشر : ادارہ تدبرِ قرآن وحدیث
رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی
سمن آباد، لاہور - ۲۵

مطبع : المطبعۃ العربیۃ-لاہور

قیمت : ۵/= روپے

تذکرہ و تبصرہ

خالد مسعود

سانحۂ مکۂ مکرمہ

دنیا بھر سے آئے ہوئے حجاج کرام اپنی زندگی بھر کی حج کی آرزو کی تکمیل کے لیے مکہ معظمہ سے منیٰ کو روانہ ہونے کے لئے آخری تیاریاں کر رہے تھے کہ یکایک مسجد حرام کے جوار میں ایک ایسا ہنگامہ ہوا جو اس گہوارۂ امن کی حرمت کو تار تار کرنے کے علاوہ سینکڑوں حاجیوں کی موت اور اتنے ہی مزید افراد کو زخمی کر دینے کا باعث بنا۔ سعودی عرب کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق کل ایک ہزار اکاون افراد ہلاک یا زخمی ہوئے۔ معلوم نہیں زخمیوں میں سے کتنے افراد ایسے تھے جو دو دن بعد مناسک حج کی ادائگی کے لئے منیٰ روانہ ہونے پر قادر نہ ہو سکے ہوں گے۔ یہ حادثہ اس جگہ پیش آیا جہاں کسی جانور کی جان لینا بھی جائز نہیں، جہاں حجاج کرام کی کل کائنات احرام کی دو چادریں ہوتی ہیں اور ان کے لئے احکام خداوندی کی ہر چھوٹی بڑی نافرمانی اور کسی طرح کے لڑائی جھگڑے کی ممانعت قرآن مجید کی نص قطعی سے ثابت ہے۔ ایسے مقام پر ہنگامہ کرنے والوں کے بارے میں یہ خبر آئی ہے کہ انہوں نے جامۂ احرام میں خنجر اور چاقو چھپا رکھے تھے، ان کے ہاتھوں میں اپنے امام خمینی کی بڑی بڑی تصاویر تھیں اور وہ میگا فونوں کے ذریعے اپنے آدمیوں کو ہدایت دے رہے تھے۔ وہ مسجد حرام کے اندر داخل ہو کر وہاں نماز کے لئے جمع ہونے والے لاکھوں حجاج تک اپنے امام کا پیغام پہنچانا چاہتے تھے۔ حکومت کو ان کے مظاہرہ کو روکنے کے لئے قوت استعمال کرنی پڑی۔

ایرانی حجاج کا حرمین شریفین میں یہ پہلا مظاہرہ نہیں تھا۔ وہ اپنے امام کی طرف سے ہر سال ایسا کرنے پر مامور ہیں۔ انہوں نے ان کو یہ تعلیم دی ہے کہ حج کے اجتماع میں سیاسی فوائد حاصل کرنے کے بڑے امکانات ہیں۔ یہاں مسلمانانِ عالم کو بڑی طاقتوں اور ان کے حلیفوں کے خلاف برانگیختہ کرنے کے مواقع موجود ہیں اور ایرانی انقلاب کو دوسرے مسلمان ممالک کو برآمد کرنے کے منصوبہ پر بھی یہاں عمل

ہو سکتا ہے۔ امام کے ان پیغامات کو پڑھیے جو وہ حج کے موقع پر جاری کرتے رہتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سفرِ حج میں مناسک و عبادات کو ثانوی حیثیت دے دی گئی ہے اور سیاسی مقاصد کے حصول کو اولیت حاصل ہے۔ ایرانیوں کی یہ ترجیحات اس وقت سمجھ میں آجاتی ہیں جب ہم یہ بات ذہن میں رکھیں کہ شیعہ کے لئے قبلہ سے زیادہ محترم نجف اشرف اور کربلا ہیں جہاں کی 'خاک پاک' پر وہ نمازیں سجدہ کرتے ہیں۔ حرمین شریفین کے مظاہروں سے مقصود ملت اسلامیہ کی کوئی بہتری نہیں ہو سکتی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اسلامی کانفرنس کے زیر اہتمام جب امت مسلمہ کو درپیش مسائل پر غور کرنے کے لئے پچاس کے قریب ممالک جمع ہوتے ہیں اس وقت حکومت ایران کسی نہ کسی بہانے شرکت سے گریز اور ان کے فیصلوں پر عمل درآمد میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ حج کے موقع پر چونکہ عامۃ المسلمین کی بہت بڑی تعداد یکجا ہوتی ہے اس لئے کوئی ہنگامہ کھڑا کر کے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانا بہت آسان ہوتا ہے۔ کسی سنجیدہ کانفرنس سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ حکومت ایران کے نمائندہ مصطفیٰ میر سلیم کی پاکستان میں آمد کے بعد حکومت پاکستان کا یہ بیان سامنے آیا ہے کہ پاکستان یہ چاہتا ہے کہ حج کے موقع پر حرمین شریفین کے تقدس کو پامال کرنے کی کوئی کارروائی آئندہ نہ ہونے پائے اور اس بارے میں سعودی عرب حکومت کے قوانین کا احترام کیا جائے۔ ہمارے نزدیک یہ نہ صرف ملت اسلامیہ پاکستان بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے دل کی آواز ہے۔ سعودی حکومت کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ حج کی عبادت کا وقار قائم رکھنے کے لئے اقدامات کرے اور اس کو سیاسی مظاہروں میں تبدیل نہ ہونے دے۔

ہر سال محرم الحرام کی آمد سے ہفتوں پہلے اخبارات میں اس طرح کے بکثرت پیغامات آنے شروع ہو جاتے ہیں کہ عشرۂ محرم میں شیعہ سنی اتحاد کا مظاہرہ ہونا چاہئے۔ چنانچہ حکومت کی زیر نگرانی ایسی امن کمیٹیاں تشکیل پاتی ہیں جن کا مقصد تعزیہ کے جلوسوں کو کامیابی سے اپنی اپنی منزل تک پہنچنے میں مدد دینا ہوتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر حضرات اپنے اپنے اضلاع کی حدود میں علماء کے داخلہ پر پابندی اور ان کی حرکت پر پہرے بٹھا دیتے ہیں۔ اس بارے میں جو بات غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ دلآزاری کا سارا سامان تو فی الحقیقت شیعہ کے پاس ہے۔ مثلاً ان کا کلمہ اور ان کی اذان الگ ہے اور وہ اس کا اعلان لاؤڈ سپیکر پر بھی کرتے ہیں ان کے عقیدے میں یہ بات شامل ہے کہ معدودے چند صحابہ کرامؓ کو چھوڑ کر باقی تمام صحابہؓ العیاذ باللہ منافق تھے۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بنات طاہرات میں سے صرف سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو آپ کی بیٹی سمجھتے ہیں حالانکہ قرآن مجید نے ان کا ذکر جمع کے صیغہ سے

کر کے اس بارے میں نص قائم کر دی ہے۔ وہ سانحہ کربلا کے بیان کی آڑ میں مسلمانوں کی محترم شخصیتوں جلیل القدر صحابہؓ اور اکابر اسلام کی توہین کرتے ہیں۔ یہ تمام کارروائی لاؤڈ سپیکر پر حکومت کے اہل کاروں کی موجودگی میں ہوتی ہے اگرچہ اس کا ایک ایک جزو ہر مسلمان کا دل فگار کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے وہ شیعہ کے جذبات کو مجروح کر سکیں۔ شیعہ کی تمام محترم شخصیتیں مسلمانوں کے نزدیک بھی لائق احترام ہیں۔ سیدہ فاطمہؓ کا ذکر ہو یا سیدنا علیؓ کا حضرات حسن و حسینؓ کی بات ہو رہی ہو یا شیعہ کے دوسرے اکابر کی، کوئی مسلمان ان کو برا بھلا کہنے یا ان کی توہین کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اجلۂ صحابہ کی شہادت کے دوسرے واقعات کی طرح سانحہ کربلا پر بھی ہر مسلمان کا دل ملول ہوتا ہے کہ کاش حضرت حسینؓ کی پیش کردہ شرائط پر عمل ہو گیا ہوتا تو یہ سانحہ پیش نہ آتا۔ رہی اس واقعہ کی تفصیل تو یہ تاریخ کا ایک موضوع ہے، یہ کوئی جذباتی مسئلہ نہیں۔ فن تاریخ میں قدیم واقعات کی تحقیق کا طریقہ طے شدہ ہے۔ مختلف مورخین کے نتائج تحقیق الگ الگ ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر سلطان اورنگ زیب عالمگیر بعض مورخین کی نظر میں انتہائی متعصب اور تنگ دل حکمران تھے لیکن دوسروں کی نظر میں وہ نہایت عالی ظرف، دور اندیش اور اپنی رعایا کو بلا امتیاز مذہب و ملت مراعات دینے والے تھے۔ کسی بھی تحقیق کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ اس کے پیش کردہ دلائل و شواہد پر ہوتا ہے نہ کہ جذبات پر۔ بعض لوگوں کو ایک قسم کے دلائل قائل کر دیتے ہیں اور دوسروں کو دوسری قسم کے۔ کسی شخص پر تاریخی واقعات کی کوئی خاص تعبیر مسلط نہیں کی جا سکتی۔

ہمارے نزدیک امر واقعہ یہ ہے کہ اہل سنت والجماعت کے کسی بھی فرقے کے ہاں شیعوں کے جذبات بھڑکانے اور ان کی دلآزاری کے لئے کوئی چیز نہیں۔ اشتعال انگیزی کے لئے پورا سامان شیعہ نے از خود فراہم کیا ہوا ہے کہ مسلمانوں کے اجلہ صحابہؓ اور امہات المومنینؓ پر دشنام طرازی کر کے وہ ان کے جذبات کو برانگیختہ کرتے ہیں اور اس مہم کو کامیابی سے چلانے کے لئے وہ محرم کے دنوں میں حکومت کا سہارا لیتے ہیں۔ چنانچہ علماء کی نقل و حرکت پر پابندیاں لگتی ہیں اور شیعہ کی زبان کو تحفظ مہیا کیا جاتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ضلع سرگودھا میں ۳۷ علماء کے داخلہ پر پابندی لگنے کی خبر اخبارات میں چھپی ہے۔ ناموں کو پڑھئے تو ان میں ۲۵ مسلمان علماء ہیں اور ۱۲ شیعہ ذاکر ہیں جن کے ضلع میں داخلہ پر پابندی لگائی گئی۔ ان ۲۵ علماء میں سے کئی ایسے ہیں کہ ہم ذاتی علم کی بناء پر یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ فتنہ و فساد نہیں پھیلاتے۔ البتہ یہ صلاحیت ان میں ہے کہ وہ علمی طریقہ سے سانحہ کربلا کا تجزیہ کر سکتے ہیں۔ گویا حکومت کے اہل کار شیعوں کا محرم پر اتنا فائق حق سمجھتے ہیں کہ وہ ان دنوں میں سنیوں کو اپنے نقطہ نظر

کی علمی تقاریر سننے کا موقع بھی نہیں دینا چاہتے۔

حکومت کے حلقوں میں شیعہ کی یہ سرپرستی کچھ تعجب انگیز نہیں لگتی جب ہم یہ دیکھیں کہ ۱۹۷۵ء سے حکومت پاکستان کے محکمہ تعلیم نے ہمارے بچوں کو اسلامیات اور تاریخ اسلام میں صرف وہ مواد پڑھنے کو دیا ہے جس کی منظوری شیعہ دیں۔ ہر جماعت کے کتاب اسلامیات کے مؤلفین اگر دو ہیں تو ایک شیعہ اور ایک سُنی ہے۔ اگر دس ہیں تو پانچ سُنی اور پانچ شیعہ ہیں۔ پھر ان مؤلفین کے مرتب کردہ مواد کو مزید چھاننے کے لئے نظرثانی کرنے والوں میں شیعہ و سُنی برابر تعداد میں رکھے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حکومت ملک کی سنی آبادی کو وہی کچھ پڑھانا چاہتی ہے جو شیعہ کی مرضی کے مطابق ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کتابوں کی مدد سے دسویں جماعت تک کوئی بچہ سیدہ فاطمہؓ کے سوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی اولاد کے نام سے واقف نہیں ہو پاتا۔ دسویں جماعت کی کتاب اسلامیات کے اس حصہ میں بھی جو سُنی طلبہ کے لئے مخصوص ہے "اولادِ نبیؐ" کے عنوان کے تحت یہ ہدایت درج ہے کہ اس کا جواب اساتذہ کتاب "رہنمائے اساتذہ" میں سے دیکھ کے بتائیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ مؤلفین کو یہ بھی منظور نہ تھا کہ سیرت النبیؐ کے ضمن میں آنحضرتؐ کی ان صاحبزادیوں کے نام آتے جن کو شیعہ تسلیم نہیں کرتے۔ اسی کتاب میں آنحضرتؐ کی مدنی زندگی کے اہم ترین واقعات میں حضرات حسنؓ و حسینؓ کا پیدا ہونا بیان کیا گیا ہے۔

شیعہ کی دلداری اس ملک میں ہے جو اسلام کے قلعہ کے طور پر قائم ہوا اور جہاں شیعہ کی آبادی صرف اڑھائی تین فی صد ہے۔ دوسری طرف ایران ہے جہاں سُنی مسلمان چالیس فی صد ہیں لیکن وہاں ان کو اپنی مسجدیں قائم کرنے یا اپنے امام مقرر کرنے کی بھی آزادی نہیں۔ وہاں امام خمینی کی مرضی کے مطابق ہر حق باطل اور ہر باطل حق ہو جاتا ہے اور کسی سُنی کو وہاں دم مارنے کی مجال نہیں۔ کاش پاکستان میں کسی کو جانبداری کی نہیں بلکہ صرف انصاف کرنے کی توفیق مل جاتی!

تدبر قرآن

خالد مسعود

تفسیر سورۂ مائدہ (۲)

اور یاد کرو[۲۳] جب کہ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، اے میرے ہم قومو! اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد کرو کہ اس نے تم میں نبی اٹھائے اور تم کو بادشاہ بنایا، اور تم کو وہ کچھ بخشا جو دنیا والوں میں سے کسی کو نہیں بخشا۔ اے میرے ہم قومو! اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے اور پیٹھ پیچھے نہ پھرو ورنہ نامرادوں میں سے ہو کر رہ جاؤ گے ۞ وہ بولے کہ اس میں تو بڑے زورآور لوگ ہیں[۲۴]۔ ہم اس میں نہیں داخل ہونے کے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ اگر وہ وہاں سے نکل جائیں تو ہم داخل ہوں گے ۞ دو شخصوں نے، جو تھے تو انہی ڈرنے والوں ہی میں سے، پر خدا کا ان پر فضل تھا، للکارا کہ تم ان پر چڑھائی کر کے شہر کے پھاٹک میں گھس جاؤ۔ جب تم اس میں گھس جاؤ گے تو تمہی غالب رہو گے اور

---

[۲۳] یہود ابتدا ہی سے خدا کے عہد کے معاملے میں بودے ثابت ہوئے اور خدا نے بھی ابتدا ہی سے ان کی بدعہدیوں اور نالائقیوں پر ان کو نہایت عبرت انگیز سزا دی۔ اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے ان کی تاریخ کے ایک اہم واقعہ کی یاد دہانی فرمائی ہے۔

[۲۴] مقدس سرزمین سے مراد کنعان اور فلسطین کا علاقہ ہے کیونکہ یہیں سے حضرت ابراہیمؑ نے اللہ کے دین کی دعوت کا آغاز کیا تھا۔ تورات کی کتاب گنتی باب ۱۳، ۱۴ کے مطابق حضرت موسیٰؑ نے دشتِ فاران میں بنی اسرائیل کو فلسطین پر حملے کے لیے ابھارا۔ انہوں نے بارہ سرداروں کی ایک پارٹی علاقے کے حالات دریافت کرنے کے لیے بھیجی۔ اس نے علاقے کی شادابی کی تو نہایت شوق انگیز رپورٹ دی۔ لیکن وہاں کے باشندوں کے قد و قامت اور ان کی زورآوری سے متعلق جو بیان دیا وہ بنی اسرائیل کے لیے نہایت حوصلہ شکن ثابت ہوا۔

اللہ پر بھروسہ کرو، اگر تم موٗمن[۲۵] ہو ۝ وہ بولے کہ اے موسیٰ، ہم اس میں ہرگز نہیں داخل ہونے کے جب تک وہ اس میں موجود ہیں تو تم اور تمہارا خداوند جا کر لڑو۔ ہم تو یہاں بیٹھتے ہیں ۝ ۲۴

موسیٰ نے دعا کی اے میرے پروردگار، میرا اپنی جان اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر کچھ زور نہیں۔ پس تو ہمارے اور اس نافرمان قوم کے درمیان علیحدگی کر دے ۝ فرمایا تو یہ سرزمین ان پر چالیس سال کے لیے حرام ٹھہری، یہ لوگ زمین میں بھٹکتے پھریں گے[۲۶]۔ پس تو ان نافرمان لوگوں کا غم نہ کھا ۝ ۲۶

اور ان کو آدم کے دو بیٹوں کی سرگزشت اس کی حکمت کے ساتھ سناؤ[۲۷] جب کہ ان دونوں نے قربانی پیش کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول ہوئی اور دوسرے کی قربانی قبول نہیں ہوئی۔ وہ بولا کہ میں تجھے قتل کر کے رہوں گا۔ اس نے جواب دیا کہ اللہ تو صرف اپنے متقی بندوں کی قربانی قبول کرتا ہے ۝ اگر تم مجھے قتل کرنے کے لیے مجھ پر دست درازی کرو گے تو میں تم کو قتل کرنے کے لیے تم پر دست درازی کرنے والا نہیں۔ میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں ۝ میں چاہتا ہوں کہ میرا گناہ اور اپنا گناہ دونوں تمہی

---

۲۵ اس قوم میں سے جس پر خوف اور بزدلی کی موت طاری تھی، دو شخصوں نے ایمان اور عزم پر استوار رہنے کی توفیق پائی۔ ان دو شخصوں کے نام تورات میں یوشع اور کالب بتائے گئے ہیں۔ انہوں نے قوم کی ہمت بندھانے کی بڑی کوشش کی لیکن بنی اسرائیل ان دونوں حوصلہ مندوں کو اپنے اندر گوارا کرنے کو بھی تیار نہ تھے۔

۲۶ حضرت موسیٰؑ کی دعا کا منشا یہ ہو سکتا ہے کہ اب اس بدعہد قوم کی قیادت و اصلاح کے بارِ عظیم سے ان کو سبکدوش کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ درخواست تو منظور نہیں فرمائی اس لیے کہ پیغمبر قوم کے لیے بمنزلہ سر درج ہوتا ہے لیکن بنی اسرائیل کی ناقدری اور بے یقینی کی سزا ان کو یہ دی کہ چالیس سال تک ان کو صحرا گردی کے لیے چھوڑ دیا۔ اس عرصہ میں غلام ذہن کی نسل ختم ہو گئی اور وہ نسل جوان ہوئی جس کے اندر آزادی و حکمرانی کی ذمہ داریوں کے لیے خود اعتمادی اور اولوالعزمی کی صفات موجود تھیں۔

۲۷ اس واقعہ سے حکمت کے کئی پہلو روشنی میں آتے ہیں مثلاً یہ کہ خدا کا خوف وہ چیز ہے جو عہدِ الٰہی پر قائم رکھتا ہے اور شیطان کی انگیخت سے پیدا ہونے والے فاسد جذبات نقضِ عہد کا باعث بنتے ہیں۔ اللہ کے نیک بندے حق و عدل کی حفاظت میں اپنی جان قربان کر دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے اور خدا پر ایمان، اس کی عبادت، اخلاص، تقویٰ، عدل و قسط، اعمال کی جزا و سزا کی تعلیمات پر عہد ابتدائے آفرینش ہی سے انسان سے لیا گیا ہے۔

لے کر لوٹو[۲۸] اور جہنم والوں میں سے بنو، یہی سزا ہے ظالموں کی ۝ ۲۹

بالآخر اس کے نفس نے اس کو اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کر لیا[۲۹] اور وہ اس کو قتل کر کے نامرادوں میں سے ہو گیا ۝ پھر خدا نے ایک کوے کو بھیجا جو زمین میں کریدتا تھا تاکہ وہ اس کو دکھائے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کو کس طرح چھپائے۔ وہ بولا کہ ہائے میری کمبختی! کیا میں اس کوے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش کو ڈھانک دیتا[۳۰]۔ سو وہ اس پر شرمسار ہوا ۝ ۳۱

اس وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ فرض کیا کہ جس کسی نے کسی کو قتل کیا بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا ملک میں فساد برپا کیا ہو تو گویا اس نے سب کو قتل کیا اور جس نے اس کو بچایا تو گویا سب کو بچایا اور ہمارے رسول ان کے پاس واضح احکام لے کر آئے لیکن اس کے باوجود ان میں بہت سے ہیں جو زیادتیاں کرتے ہیں[۳۱] ۝ ۳۲

ان لوگوں کی سزا، جو اللہ اور اس کے رسول سے بغاوت کرتے ہیں اور ملک میں فساد برپا کرنے میں سرگرم ہیں، بس یہ ہے کہ عبرت ناک طور پر قتل کیے جائیں یا سولی پر لٹکائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور

---

۲۸ یعنی میں تمہارے قتل میں پہل کر کے کوئی بارِ گناہ اپنے سر لیے ہوئے اپنے رب کی طرف نہیں پلٹنا چاہتا۔ اگر تم یہ بوجھ اٹھا سکتے ہو تو اٹھاؤ۔ یہ ہابیل نے پہل کرنے کی نفی کی ہے۔ بچاؤ کی نفی نہیں کی ہے۔ اپنی جان اور اپنے مال کی مدافعت کرنا خوفِ خدا کے منافی بات نہیں ہے۔

۲۹ اس اسلوب بیان سے اس اندرونی کش مکش کا اظہار ہو رہا ہے جو ارادۂ قتل سے قابیل کے اندر پیدا ہوئی۔ یہ جھجک ہر مجرم کو جرم کا ارادہ کرنے پر پیش آتی ہے۔ قابیل کے حسد نے بالآخر اس کو قتل کے جرم پر آمادہ کر ہی لیا۔

۳۰ معلوم ہوتا ہے قابیل نے اپنے بھائی کی لاش یوں ہی پڑی چھوڑ دی تھی، اس کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ کوے کے زمین کریدنے سے اسے اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کی تدبیر سمجھ میں آئی۔ جو لوگ خدا سے نہیں ڈرتے وہ خلق سے ڈرتے اور جو خدا کے حکم اور ضمیر کی آواز کی پروا نہیں کرتے وہ کوے سے الہام حاصل کرتے ہیں۔ ان آیات میں کوا شیطان کی مثال ہے جو جرم پر اکساتا اور پھر اس کو چھپانے کی تدبیریں سجھاتا ہے۔

۳۱ یعنی قابیل کی شر و فساد کی ذہنیت کا اظہار چونکہ لوگوں کی طرف سے برابر ہوتا رہتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی شریعت میں قصاص کو ایک جماعتی فرض قرار دیا، پھر اس قانون کی تجدید و یاد دہانی کے لیے رسول بھیجے لیکن بنی اسرائیل اللہ کے میثاق کے معاملے میں اتنے جری اور بے باک ہیں کہ خدا کی زمین میں برابر فساد برپا کیے چلے جا رہے ہیں۔

پاؤں بے ترتیب کاٹ ڈالے جائیں یا ملک سے باہر نکال دیے جائیں[۳۲]۔ یہ ان کے لیے اس دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لیے ایک عذاب عظیم ہے ؕ مگر جو لوگ تمہارے قابو پانے سے پہلے ہی توبہ کر لیں تو سمجھ لو کہ اللہ مغفرت فرمانے والا اور مہربان ہے[۳۳] ؕ ۳۴

اے ایمان والو، اللہ سے ڈرتے رہو اور اسی کے تقرب کے طالب بنو اور اس کی راہ میں برابر سرگرم کار رہو تاکہ فلاح پاؤ ؕ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا ہے اگر انہیں وہ سب کچھ حاصل ہو جائے جو زمین میں ہے اور اس کے برابر اور بھی تاکہ وہ اس کو فدیہ میں دے کر روز قیامت کے عذاب سے چھوٹ سکیں تو بھی ان کا یہ فدیہ قبول نہ ہوگا، ان کے لیے بس ایک دردناک عذاب ہی ہے ؕ وہ زور لگائیں گے کہ آگ سے نکل بھاگیں، لیکن اس سے کبھی نکل نہ پائیں گے۔ ان کے لیے ایک دائمی عذاب ہوگا ؕ ۳۷

اور چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو[۳۵]، ان کے کیے کی پاداش اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک

---

[۳۲] ایک اسلامی حکومت کے اندر جو مفسدانہ سرگرمی ملک کے سیاسی، اجتماعی اور معاشرتی نظام کے لیے خطرہ بن جائے اور اس سے قانون اور نظم کا مسئلہ پیدا ہو جائے اس کے استیصال اور اس کے مجرموں کی سرکوبی کے لیے حکومت کے ارباب حل و عقد کو جو وسیع اختیارات دیے گئے ہیں تاکہ قیام عدل کے فریضہ سے وہ عہدہ برا ہو سکیں، یہ ان کا بیان ہے۔ حالات کی نوعیت اور بدامنی اور قانون شکنی کے موجود اور متوقع اثرات کے لحاظ سے حکومت ان میں سے جو اقدام بھی مناسب سمجھے، کر سکتی ہے۔

[۳۳] گویا جو لوگ حکومت کے ایکشن سے پہلے ہی اپنے رویہ کی اصلاح کر چکے ہوں ان کے ساتھ عام قانون کے تحت معاملہ ہوگا۔

[۳۴] آیت کے لفظ 'وسیلہ' کے معنی قربت کے ہیں۔ خدا اور اس کے بندوں کے درمیان واسطہ کتاب اللہ اور شریعت ہی ہے۔ اس وجہ سے کتاب اللہ اور شریعت کو مضبوطی سے تھامنا ہی خدا سے قربت کا ذریعہ ہے۔

اگر خدا کی شریعت کو چھوڑ کر یہود و نصاریٰ کی طرح دوسرے سہاروں پر اعتماد کیا جائے تو یہ سہارے نافع ہونے کے بجائے موجب وبال ہوں گے۔

[۳۵] چوری ایک منفرد جرم نہیں بلکہ مجموعہ جرائم ہے جس کی طرح طرح کے ہولناک جرائم ظہور میں آتے ہیں۔ اس لیے چور کی عبرت ناک سزا مقرر کی گئی ہے۔ چونکہ 'سارق' اور 'سارقہ' صفت کے صیغے ہیں اس لیے قطع ید کی سزا اس وقت ہوگی جب کہ اس کے ارتکاب پر 'چوری' اور اس کے مرتکب پر 'چور' کا اطلاق ہو سکے۔ لہٰذا فقہا نے قطع ید کی سزا کے لیے یہ ضروری

سزا کے طور پر اور اللہ غالب اور حکیم ہے ؕ پس جس نے اپنے اس ظلم کے بعد توبہ اور اصلاح کر لی تو اللہ اس پر عنایت کی نظر فرمائے گا[۳۶]، بے شک اللہ غفور و رحیم ہے ؕ کیا تمہیں علم نہیں ہے کہ اللہ ہی ہے جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے، وہی جس کو چاہے گا سزا دے گا اور جس کو چاہے گا بخشے گا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ؕ ۴۰

قرار دیا ہے کہ چوری کسی قدر و قیمت رکھنے والی چیز کی گئی ہو، یہ محفوظ کیے گئے مال کی ہو، اس مال میں چور کا اشتراک نہ ہو، چور مجنون یا نابالغ یا مالک کا قریبی عزیز یا ملازم نہ ہو، چور کو اضطرار نہ درپیش ہو، وغیرہ۔ مزید برآں یہ سزا دارالاسلام میں نافذ ہوگی۔

[۳۶] اس توبہ کے سبب سے شریعت کی حد ساقط نہ ہوگی، وہ بہرحال نافذ ہوگی۔

تدبر حدیث

امین احسن اصلاحی

نمازوں کے اوقات ــــ ١

[مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہٗ ایک عرصہ سے موطا امام مالک کا درس ادارہ کے کارکنان کو دے رہے ہیں۔ مولانا محترم کے درس حدیث کو افادۂ عام کے لیے مرتب کرنے کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔ اس کی پہلی قسط پیش خدمت ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ ہر اشاعت میں یہ درس ضروری اور مفید اضافوں کے ساتھ شامل کیا جائے گا۔]

موطا امام مالک کی کتاب وقوت الصلوٰۃ کی احادیث

١۔ قَالَ : حدثنی یحیی بن یحیی اللیثی، عن مالك بن انس، عن ابن شهاب، اَنَّ عُمَرَ بْنَ عَبْدِ الْعَزِيْزِ اَخَّرَ الصَّلٰوةَ يومًا، فَدَخَلَ عَلَيْهِ عُرْوَةُ بْنُ الزُّبَيْرِ فَاَخْبَرَهُ اَنَّ الْمُغِيْرَةَ بن شُعْبَةَ اَخَّرَ الصَّلٰوةَ يَوْمًا وَهُوَ بِالْكُوْفَةِ فَدَخَلَ عَلَيْهِ اَبُوْ مَسْعُوْدٍ الْاَنْصَارِيُّ، فَقَالَ: مَا هٰذَا يَا مُغِيْرَةُ؟ اَلَيْسَ قَدْ عَلِمْتَ اَنَّ جِبْرِيْلَ نَزَلَ فَصَلّٰى، فَصَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. ثُمَّ صَلّٰى، فَصَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. ثُمَّ صَلّٰى، فَصَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. ثُمَّ صَلّٰى، فَصَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. ثُمَّ صَلّٰى، فَصَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. ثُمَّ قَالَ: بِهٰذَا اُمِرْتَ. فَقَالَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ: اِعْلَمْ مَا تُحَدِّثُ بِهِ يَا عُرْوَةُ، اَوَ اِنَّ جِبْرِيْلَ هُوَ الَّذِيْ اَقَامَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقْتَ الصَّلٰوةِ؟ قَالَ عُرْوَةُ: كَذٰلِكَ كَانَ بَشِيْرُ ابْنُ اَبِيْ مَسْعُوْدٍ الْاَنْصَارِيُّ يُحَدِّثُ عَنْ اَبِيْهِ۔

□ ... ابن شہاب روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک دن نماز

(عصر) میں دیر کر دی تو عروہ بن زبیرؒ ان کے پاس آئے اور ان کو خبر دی کہ مغیرہ بن شعبہؓ نے ایک دن نماز (عصر) میں تاخیر کر دی جبکہ وہ کوفہ کے گورنر تھے، تو ابو مسعود انصاریؓ ان کے پاس آئے اور کہا کہ مغیرہ! یہ کیا بات ہوئی؟ آپ کو پتہ نہیں ہے کہ جبریلؑ اترے اور انہوں نے نماز پڑھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی۔ پھر انہوں نے (دوسری) نماز پڑھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی۔ پھر انہوں نے (تیسری) نماز پڑھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی۔ پھر انہوں نے (چوتھی) نماز پڑھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی۔ پھر انہوں نے (پانچویں) نماز پڑھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی۔ اس کے بعد جبریلؑ نے فرمایا کہ آپ کو اسی کا حکم دیا گیا ہے۔ اس پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا: ذرا سوچ لیجیے کہ آپ کیا فرماتے ہیں، اے عروہ! کیا واقعہ یہی ہے کہ یہ جبریل امینؑ ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نمازوں کے اوقات مقرر کیے؟ تو عروہ نے فرمایا کہ بشیر بن ابو مسعود انصاری اپنے والد سے اسی طرح روایت کرتے ہیں۔

اس روایت کو امام بخاری صحیح البخاری: کتاب مواقیت الصلوٰۃ، باب (١) اور امام مسلم صحیح مسلم: کتاب المساجد ومواضع الصلوٰۃ، باب ٣ میں لائے ہیں۔

وُقُوْتٌ : 'وقت' کی جمع ہے۔

اَخَّرَ الصَّلٰوةَ : اَخَّرَ یعنی وقت سے پیچھے کر دی۔ 'الصلوٰۃ' سے آگے کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ عصر کی نماز مراد ہے۔

اِعْلَمْ : یعنی جان لیجیے، سوچ لیجیے، غور کر لیجیے۔

قَالَ: روایت کے آغاز میں 'قال' کے فاعل یحییٰ بن یحییٰ مصمودی کے بیٹے عبیداللہ لیثی ہیں۔ یحییٰ بن یحییٰ مصمودی امام مالکؒ کے ممتاز ترین شاگرد ہیں۔ یہ امام مالکؒ سے دو تین سلسلوں سے روایت کرتے ہیں اور ان کی روایت مقبول ترین ہے۔ انہی کے شاگردوں کے ذریعے موطا کی روایت عالم اسلام میں پھیلی۔ موطا امام مالک کے مشہور شارح، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بھی انہی کی روایت کو لیا ہے۔

بِهٰذَا اُمِرْتَ : یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ آپ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ پانچ وقت یہ نمازیں پڑھیں۔

اس روایت سے نمازوں کے اوقات کی تاریخ معلوم ہوتی ہے

نمازوں کے اوقات کے بارے میں قرآن مجید میں صرف اشارات ملتے ہیں مثلاً :

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّھَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ط

اور نماز کا اہتمام کرو، دن کے دونوں حصوں میں اور شب کے کچھ حصہ میں۔

(ھود - ۱۱ : ۱۱۴)

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ط

نماز کا اہتمام رکھو زوالِ آفتاب کے اوقات سے لے کر شب کے تاریک ہونے تک اور خاص کر فجر کی قرارت کا۔

(بنی اسرآءیل - ۱۷ : ۷۸)

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِھَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّیْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّھَارِ لَعَلَّکَ تَرْضٰی ہ

اور اپنے رب کی، اس کی حمد کے ساتھ، تسبیح کرو سورج کے طلوع اور اس کے غروب سے پہلے اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو اور ان کے اطراف میں بھی تاکہ تم نہال ہو جاؤ۔

(طٰہٰ - ۲۰ : ۱۳۰)

قرآن میں اوقات کے حوالے سے عشی، اناء الّیل اور فجر وغیرہ کے جو الفاظ آتے ہیں ان میں کون کون نمازیں ہیں ان کی تفصیل قرآن میں نہیں ہے۔ صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ نماز کا حکم ہے، اوقات سے متعلق صرف اشارات ہیں جس کی تفصیل سنت میں ملتی ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں نماز کی اہمیت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے نمازوں کے اوقات کی ٹھیک ٹھیک تعلیم کے لیے یہ اعلیٰ اہتمام فرمایا کہ جبریل امینؑ نے بنفسِ نفیس پانچوں نمازوں کی ادائیگی ٹھیک وقتوں پر کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی تعلیم دی، صرف اجمالی ہدایات پر کفایت نہیں کی گئی۔

یہی تعلیم عملی تواتر کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے۔ نمازوں کے اوقات ہم نے صرف اخبارِ آحاد سے نہیں جانے ہیں، بلکہ اس کا سلسلہ جبریل امینؑ، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ اور پھر بتدریج صلحائے امت کے عملی تواتر سے برابر چلا آرہا ہے اور اس طرح یہ برابر قائم و دائم رہے گا۔ احادیث میں اگر ان کا ذکر ہے تو یہ ایک مزید اہتمام ہے۔ قرآن مجید میں اگر اوقات کی تفصیل نہیں ہے تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو موجبِ اعتراض ہو۔ قرآن نے زیادہ تر کلیات ہی سے بحث

کی ہے۔ اگر وہ جزئیات سے بھی بحث کرتا تو فقط اوقات معین کرنے کے لیے بقرہ سے بڑی سورہ کا نزول ضروری ہو جاتا۔ جو چیزیں سکھانے اور عمل کر کے بتانے کی ہوتی ہیں ان کے لیے صحیح طریقہ یہی ہوتا ہے کہ وہ عمل کر کے دکھا دی جائیں۔ چنانچہ اس طرح کی چیزیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کر کے دکھا دیں، آپ کے صحابہ نے سیکھ لیں اور پھر عملی تواتر سے دوسروں کو منتقل ہو گئیں۔ اب اس کے کسی جزیئے میں کوئی اختلاف ہوتا ہے تو اس کو اہمیت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ نگاہ اصول پر رکھنی چاہیے۔

جہاں تک نمازوں کے اوقات کی حکمت کا تعلق ہے تو ایک حقیقت بالکل واضح ہے کہ نمازوں کے اوقات کے لیے رب العالمین نے وہ اوقات منتخب کیے ہیں جو ہمارے مشاہدے کے لحاظ سے کائنات میں کسی بڑے انقلاب کی علامت ہیں۔ مثلاً جب سورج اپنے کمال عروج پر پہنچ کر جھک پڑتا ہے تو ظہر کا وقت ہوتا ہے، جب یہی سورج پہاڑوں اور ٹیلوں سے بھی نیچے اترنے اور مزید جھکنے لگتا ہے تو عصر کا وقت ہوتا ہے، جب سورج کی تمام آب و تاب ختم ہو جاتی ہے اور وہ پردے میں چھپ جاتا ہے تو مغرب کا وقت ہوتا ہے، رات جب پوری طرح چھا جاتی ہے تو عشاء کا وقت ہوتا ہے اور جب رات کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے اور افق سے کچھ دوسرے آثار ظاہر ہو رہے ہوتے ہیں تو فجر کا وقت ہوتا ہے۔

اس روایت سے مندرجہ ذیل امور کا علم بھی حاصل ہوتا ہے؛

ایک یہ کہ اسلام کے سیاسی نظام میں خلیفۂ وقت یا امیرالمومنین کے بنیادی فرائض میں یہ چیز شامل ہے کہ وہ نمازوں میں مسلمانوں کی امامت کرے۔ اسی طرح اس کے گورنروں اور دوسرے انتظامی سربراہوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے اپنے دائروں میں یہ فریضہ انجام دیں۔

دوسرے یہ کہ اس امت کے دورِ اوّل میں نمازوں کا یہ اہتمام رہا ہے کہ امت کا ایک عام فرد بھی خلیفۂ وقت کو معمولی تاخیر پر ٹوک دیتا تھا اور خلیفہ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتا تھا۔

تیسرے یہ کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو یہ تجسس تھا کہ نمازوں کے اوقات کس طرح معین ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب ان کے سامنے یہ بات آئی کہ یہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت جبریلؑ نے معین کیے ہیں تو انھوں نے اس کو پوری اہمیت دی اور راوی پر جرح کر کے مزید وضاحت کرالی۔

٢ – قَالَ عُرْوَةُ : وَلَقَدْ حَدَّثَتْنِي عَائِشَةُ زَوْجُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّي الْعَصْرَ وَالشَّمْسُ فِي حُجْرَتِهَا، قَبْلَ أَنْ تَظْهَرَ۔

□ ... حضرت عروہؒ ام المومنین، حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عصر کی نماز اس وقت پڑھتے تھے جبکہ دھوپ ابھی ان کے کمرے میں ہوتی تھی، دیوار پر نہیں چڑھی ہوتی تھی۔

یہ روایت صحیح البخاری: کتاب مواقیت الصلوٰۃ، باب ١ اور صحیح مسلم: کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، باب ٣١ میں بھی نقل ہوئی ہے۔

تَظْهَرَ : ظَهَرَ يَظْهَرُ کے معنی دیوار پر چڑھنے کے بھی آتے ہیں۔ قرآن مجید میں بھی یہ لفظ ان معنوں میں آیا ہے: 'لَجَعَلْنَا لِمَنْ يَكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوتِهِمْ سُقُفًا مِنْ فِضَّةٍ وَمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُونَ' (الزخرف - ٤٣ : ٣٣) (تو جو لوگ خدائے رحمان کے منکر ہیں ہم ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کر دیتے اور زینے بھی چاندی کے جن پر وہ چڑھتے)۔

عروہؒ سے پہلے سورج جب تک ذرا اونچا رہتا ہے اس وقت تک اس کی دھوپ دروازے کے راستے اندر کمرے میں داخل رہتی ہے، لیکن جب زیادہ جھک جاتا ہے تو دھوپ دیوار پر چڑھ جاتی ہے۔

اس روایت کی رو سے عصر کا ٹھیک وقت اس وقت ہوتا ہے جبکہ دھوپ کمرے میں پھیلی ہوئی ہو۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ سورج زوال کے بعد بھی کافی اونچا ہو۔ اس معاملے میں ہمارے ہاں بڑی افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ بعض غالی لوگ اتنے پہلے عصر پڑھ لیتے ہیں کہ گمان ہوتا ہے کہ شاید وہ وقت سے پہلے ہی فارغ ہو بیٹھے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ اتنی تاخیر کر دیتے ہیں کہ وقت کی جان ہی، نکال لیتے ہیں۔

اس حدیث کو یہاں نقل کرنے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ پر اعتراض ہوا تھا کہ انہوں نے نمازِ عصر میں تاخیر کر دی۔ یہ روایت گویا یہ بتانے کے لیے رکھی گئی کہ نمازِ عصر کے معاملے میں سنت یہ ہے کہ وہ جلد پڑھی جائے۔

٣ - وحدثني يحيى عن مالك عن زيد بن اسلم، عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ، أَنَّهُ قَالَ : جَاءَ رَجُلٌ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَسَأَلَهُ عَنْ وَقْتِ صَلَاةِ الصُّبْحِ۔ قَالَ : فَسَكَتَ عَنْهُ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ حَتَّى إِذَا كَانَ مِنَ الْغَدِ، صَلَّى الصُّبْحَ حِينَ طَلَعَ الْفَجْرُ۔ ثُمَّ صَلَّى الصُّبْحَ مِنَ الْغَدِ بَعْدَ أَنْ أَسْفَرَ۔ ثُمَّ قَالَ : أَيْنَ السَّائِلُ عَنْ وَقْتِ الصَّلَاةِ؟ قَالَ : هَا أَنَذَا يَا رَسُولَ اللّٰهِ! فَقَالَ: مَا بَيْنَ هٰذَيْنِ وَقْتٌ۔

□ ... عطا بن یسار سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے فجر کی نماز کے وقت کے بارے میں پوچھا۔ حضورؐ نے اس وقت اس کو جواب نہیں دیا یہاں تک کہ جب دوسرا دن ہوا تو آپؐ نے صبح کی نماز ٹھیک اس وقت پڑھی جب فجر طلوع ہوئی۔ پھر اگلے دن آپؐ نے صبح کی نماز اس وقت پڑھی جب صبح روشن ہو گئی۔ پھر آپؐ نے پوچھا۔ نماز کے وقت کے بارے میں سوال کرنے والا کہاں ہے؟ اس نے کہا: میں یہاں ہوں، یا رسول اللہ! آپؐ نے ارشاد فرمایا: ان دونوں اوقات کے درمیان نمازِ فجر کا اصل وقت ہے۔

یہ روایت سنن نسائی: کتاب الاذان، باب ١٢ میں بھی نقل ہوئی ہے

'اسفار' کے معنی ہیں بالکل واضح اور روشن ہو جانا۔ یعنی جب فضا صاف ہو جائے اور آدمی آدمی کو پہچان لے کہ دہنے کون کھڑا ہے اور بائیں کون ہے۔

'هَا أَنَذَا'۔ یہ 'ها' تنبیہ کا کلمہ ہے اور یہ اسی طریقہ سے استعمال ہوتا ہے اس عبارت کا مطلب ہے: میں یہاں ہوں، حضور! میں یہ رہا، حضور!

اس اسلوبِ جواب سے سائل کا استعجاب اور اس کی مسرت کا اظہار ہو رہا ہے کہ اتنی دیر کے بعد بھی حضورؐ نے اس کو یاد رکھا اور بحمداللہ اس کا سوال کسی ناخوشی کا باعث نہیں ہوا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل کے سامنے فجر کے ابتدائی اور انتہائی اوقات متعین فرما دیے، ساتھ ہی ارشاد فرما دیا کہ وقت ان دونوں کے درمیان ہے۔ یعنی سب سے زیادہ صحیح، موزوں اور ٹھیک

وقت ان کے درمیان ہے۔ گویا نماز پو پھٹنے کے فوراً بعد بھی پڑھی جاسکتی ہے اور اس وقت بھی جب صبح کا دھندلکا ختم ہو جائے۔ تاہم ان دو انتہاؤں کے درمیان افراط و تفریط کا شکار ہوئے بغیر نماز پڑھنی چاہیے۔

یہاں یہ پہلو بھی پیش نظر رکھیے کہ اوقات بتانے کے طریقے بہت سادہ، فطری اور عملی ہیں۔ اسی طریقہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست استفادہ کرنے والے نہایت آسانی سے اوقات کو سمجھ سکتے تھے۔ اسلام چونکہ دین فطرت ہے اور اس کی تعلیم عالمگیر مزاج رکھتی ہے اس لیے اوقات وغیرہ کی تعیین کا فطری انداز ہی موزوں ہو سکتا تھا۔ البتہ اس زمانے میں اگر آپ اس کے لیے جدید طریقے اختیار کریں گے تو یہ بات مذہب کے خلاف نہ ہوگی، لیکن یہ بات فراموش نہ کیجیے کہ اُس زمانے میں لوگ اپنے اونٹوں کی رفتار سے بھی اوقات کا اندازہ کر لیتے تھے اور یہ اندازہ غلط نہیں ہوتا تھا۔

۴۔ وحدّثني يحيٰى عن مالك، عن يحيٰى بن سعيد، عن عمرة بنت عبد الرحمٰن، عَنْ عَائِشَةَ، زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، أَنَّهَا قَالَتْ: إِنْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيُصَلِّي الصُّبْحَ فَيَنْصَرِفُ النِّسَاءُ مُتَلَفِّعَاتٍ بِمُرُوْطِهِنَّ، مَا يُعْرَفْنَ مِنَ الْغَلَسِ۔

□ ... ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز پڑھتے تھے، اس کے بعد عورتیں اپنی چادروں میں لپٹی ہوئی لوٹتی تھیں اور اندھیرے کے سبب سے پہچان نہیں پڑتی تھیں۔

یہ روایت صحیح البخاری: کتاب مواقیت الصلوٰۃ، باب ۲۷ اور صحیح مسلم: کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، باب ۴۰ میں بھی ہے۔

'اِنْ': یہاں اِن مخففہ ہے جو اِنَّ کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد 'لَيُصَلِّي' کا ابتدائی لام اس کی نشانی ہے۔

'مُرُوْط'، 'مرط' کی جمع ہے۔ گھر سے باہر نکلتے یا صبح کے وقت خاص طور پر عورتیں جو چادر لیتی تھیں وہ مرط کہلاتی تھی۔ یہ 'خمار' سے مختلف ہے جس کے معنی اوڑھنی کے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں جب مسجد کو جاتیں تو بڑے اہتمام سے چادروں میں لپٹی لپٹائی جاتی تھیں۔

'متلفعات' سے اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

'غَلَسْ' کے معنی صبح کا اندھیرا ہے۔

اس روایت میں صبح کی نماز کے وقت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وقت ایسا ہوتا کہ عورتیں پہچان نہیں پڑتی تھیں۔ ان کا پہچان نہ پڑنا اس بات کی تعبیر ہے کہ اختتام نماز تک اتنا اندھیرا ہوتا کہ کسی شخص کو معیّن کرنا آسان نہ ہوتا۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معمول کی پیروی کا تقاضا تو یہ ہے کہ نماز ایسے وقت میں پڑھی جائے کہ مسجد سے نکلیں تو کچھ اندھیرا ہو۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہی طریقہ تھا اور یہی طریقہ صحابہ کرامؓ کا بھی رہا ہے، لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا عمر فاروقؓ کے حادثۂ شہادت کے بعد اس معاملہ میں کچھ احتیاط کی روش اختیار کی گئی۔ چنانچہ حضرت عثمان غنیؓ نے وقت کچھ پیچھے کر دیا۔ اوپر کی روایت کی رو سے اس بات کی گنجائش خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ (جاری ہے)

(اضافہ و ترتیب: ماجد خاور)

افادات فراہی
خالد مسعود

حکمتِ قرآن (۱)

[مولانا حمیدالدین فراہیؒ کی غیر مطبوعہ کتاب حکمت القرآن کا ترجمہ]

اس سے قبل کہ ہم یہ بتائیں کہ قرآن حکیم کی وہ حکمت کیا ہے جس سے اس نے ہمیں روشناس کرایا ہے، ہم حکمت کی تعریف میں سلف کے اقوال کسی قدر وضاحت کرتے ہوئے بیان کریں گے کہ ان سے ان کی کیا مراد ہے۔ مالک اور ابورزین کے نزدیک حکمت سے مراد دین کی سمجھ بوجھ اور وہ فہم ہے جو ایک مستقل صفت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نور ہوتا ہے۔ مجاہد نے حکمت سے مراد قرآن مجید کے فہم کو لیا ہے۔ مقاتل کی رائے میں علم اور اس کے مطابق عمل کا نام حکمت ہے لہٰذا جب تک علم اور عمل کسی آدمی میں جمع نہ ہو جائیں وہ حکیم نہیں ہو سکتا۔ مقاتل کے قول کا مفہوم یہ ہے کہ حکمت کا علم رکھنے کے بعد اس کے مطابق عمل ضروری ہوتا ہے۔ لہٰذا جب تک حکمت کے ایک عالم کا عمل اپنے علم کے مطابق نہ ہو تو وہ حکیم نہیں ہوتا۔ ابن زید کے نزدیک ہر وہ بات جو آدمی کو تنبیہ کرے اور کسی نیکی کی طرف بلائے یا کسی برے کام سے روکے وہ حکمت کی بات ہے۔ ابوجعفر محمد بن یعقوب ہر اس صحیح بات کو حکمت قرار دیتے ہیں جس سے صحیح فعل پیدا ہو۔ یحییٰ بن معاذ کی رائے میں حکمت اللہ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے جس کو وہ عارفین کے دلوں کی طرف بھیجتا ہے تاکہ ان پر دنیا کی سرگرمی کے مضر اثرات کا ازالہ کرے۔

حکمت کے مقامات:

اللہ کی توفیق سے ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ تمام اقوال اصل میں ایک ہی حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں۔

عباراتنا شتّیٰ وحسنک واحد ۔۔۔ وکل الی ذاک الجمال یشیر[۱]

یہ جاننا چاہیے کہ حکمت کے کئی مقامات ہیں۔ پہلا مقام دل ہے جس میں سے حکمت، بصیرت اور توفیق کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ مالک، ابورزین، مجاہد اور یحییٰ بن معاذ نے حکمت سے یہی مراد لیا ہے۔ مجاہد نے حکمت کے مفہوم میں قرآن مجید کے فہم کو اس لیے خاص کر دیا ہے کہ وہ حکمت کی بنیاد ہے۔ جس نے قرآن کو سمجھ لیا وہ حکمت کے خزانے سے واقف ہو گیا۔ ہو سکتا ہے مجاہد کے پیش نظر آیت 'یعلمھم الکتاب والحکمۃ' کی یہ تاویل رہی ہو کہ کتاب سے مراد قرآن مجید اور حکمت سے مراد اس کا فہم ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مجاہد نے یہ مفہوم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی روشنی میں بیان کیا ہو اوتیت القرآن ومثلہ معہ بل اکثر (مجھے قرآن عطا کیا گیا اور اس کے ساتھ اور بھی، اسی کے مانند بلکہ اس سے زیادہ) حکمت سے فہم قرآن کو مراد لینا اس مفہوم سے زیادہ قرین قیاس ہے جس مفہوم کی طرف امام شافعی یا دوسرے اصحاب حدیث گئے ہیں۔ ان کے نزدیک کتاب سے مراد قرآن اور حکمت سے مراد سنت ہے۔ اسی لیے انہوں نے حدیث کا مفہوم یہ سمجھا کہ سنت قرآن کی مانند بلکہ اس سے زیادہ ہے۔ وہ قرآن سے قریب تر سنت سے زیادہ کسی اور چیز کو نہ جانتے تھے۔ حکمت کا دوسرا مقام کلام میں ہے۔ اسی لیے حکمت کا کلمہ وہ ہے جو حق ہو، صحیح ہو یا نصیحت ہو۔ ابن زید اور ابوجعفر محمد بن یعقوب کے قول کا مفہوم یہی ہے۔ حکمت کا تیسرا مقام علم و عمل میں بھی ہے اور یہ دونوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ مقاتل نے حکمت کو اسی مفہوم میں لیا ہے۔ قرآن مجید نے لفظ حکمت کا اطلاق ان تمام پہلوؤں پر کیا ہے۔ ہر جگہ قرینہ یہ بتاتا ہے کہ ان میں سے کونسا پہلو اس جگہ مراد ہے۔ دل، کلام یا علم و عمل ہر مقام میں حکمت علمی یا عملی دونوں پہلوؤں سے مراد ہوتی ہے بلکہ غور کرنے سے اس کے مزید پہلو بھی سامنے آتے ہیں البتہ حکمت بمعنی بصیرت و توفیق اصل ہوتی ہے جبکہ باقی چیزیں اس کے آثار اور مظاہر کی حیثیت رکھتی ہیں۔

حکمت کی خصوصیات:

علماء کے مذکورہ اقوال کے بعض پہلو اشارات کی نوعیت کے بھی ہیں جن پر متنبہ ہونا نہایت ضروری ہے۔ اوّلاً یہ کہ حکمت خواہ نصیحت کے انداز کی ہو یا حق بات کے طور پر ہو، یہ ضروری ہے کہ وہ بالکل واضح ہو اور کسی

۱۔ تیرا حسن ایک ہی حقیقت ہے پر اس کے لیے ہماری تعبیریں الگ الگ ہیں۔ اصل میں ہر تعبیر اسی جمال کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

دلیل کی محتاج نہ ہو۔ ثانیاً، قلب کو جب حکمت حاصل ہو جاتی ہے تو اس کو رفعت عطا کرتی ہے۔ ایک حکیم نفس کی بندگی سے بالاتر ہو کر دنیا کے مضر اثرات سے اپنے دل کو پاک کر لیتا ہے۔ لہٰذا وہ خدا کو پہچاننے والا، مصیبت پر صبر کرنے والا، نعمت پر شکر ادا کرنے والا، بردبار، درگزر کرنے والا، سخی، شریف، دردمند اور خدا کی جانب جھکنے والا بن جاتا ہے۔ یہ وہ شخص ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ طبیعت کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان کے نور کی طرف لے جاتا ہے۔ ثالثاً، حکمت ان علوم کے مجموعہ کا نام نہیں جو سیکھے جاتے ہیں بلکہ یہ ایک نور ہے جو شے اس کے قریب آئے اس کو یہ روشن کر دیتی ہے۔ اس میں خیر و شر یا خوبی و خرابی کے تمام پہلو واضح کر دیتی ہے۔ لہٰذا یہ ایک حالت اور صفت ہے۔ چونکہ علم کا سروکار بھی انہی امور سے ہوتا ہے اس لیے کبھی علم کا لفظ بھی اس معنی میں استعمال کر لیا جاتا ہے۔ رابعاً، حکمت درحقیقت روح اور قوت ہے۔ یہ ان علوم کی مانند نہیں جو عمل سے عاری ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ علم و عمل کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کی مثال سورج اور اس کی روشنی یا آگ اور اس کی حرارت سے بھی جا سکتی ہے۔ خامساً، حکمت کا تعلق ان امور سے ہے جو نیک بختی اور نفس کی پاکیزگی کا وسیلہ ہیں۔ وہ علوم جن کا حاصل دنیوی زندگی کے فائدے ہیں مثلاً دستکاریاں، فنون یا محض ایسی واقفیت جس کے ساتھ تزکیۂ نفس اور نیک اعمال کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، حکمت اور ایمان کے دائرے سے خارج ہیں۔ سادساً، بنیادی نیکیوں مثلاً سخاوت، عدل، پاک دامنی وغیرہ میں چونکہ حکمت کا عمل دخل زیادہ ہے اس لیے ایک حکیم ان کو ایک واضح اصول کے طور پر جانتا ہے، اس لیے جب اس سے کوئی سوال کیا جائے یا اسے ان پر گفتگو کی ضرورت محسوس ہو تو وہ احکام کی جزئیات میں انہی اصولوں کی بنیاد پر اور حکمت کی مدد سے اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ یہ بنیادی نیکیاں بھی حکمت کہلاتی ہیں۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں انجیل کو حکمت کہا گیا ہے اور اسی طرح کی بنیادی نیکیاں قرآن مجید میں جہاں بیان ہوئی ہیں، اس کے آخر میں یہ آیت آئی ہے:

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ — یہ احکام اس حکمت کا حصہ ہیں جو تیرے رب نے تیری طرف وحی کی ہے۔

(بنی اسرائیل ۱۷ : ۳۹)

اسی طرح حضرت لقمان کے نصائح بیان کرنے سے پہلے فرمایا:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ — بے شک ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی۔

(لقمٰن - ۱۲)

سابعاً، دل کے اندر حکمت کوئی بہت ہی لمبی چوڑی، باریک اور گہری چیز نہیں بلکہ نہایت ہلکی سی چیز ہوتی

ہے اس لیے حکیم کو اس شخص کی حالت پر تعجب ہوتا ہے جس کو یہ حاصل نہیں ہوتی۔ اس حقیقت کو ہم ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔ ایک آدمی نماز پڑھتا ہے۔ اس کی زبان پر ذکر کے کلمات جاری ہوتے ہیں لیکن اپنے دل میں نہ وہ خشوع پاتا ہے نہ خدا کی یاد، تو ایک حکیم آدمی کو اس پر تعجب ہوتا ہے۔ یہ بات اسے نہایت سنگین نظر آتی ہے کہ ایک بندہ کھڑا تو ہو اپنے آقا کے سامنے، وہ زبان سے اس سے باتیں بھی کر رہا ہو اور سرگوشیاں بھی، وہ اس کی آیات کی تلاوت بھی کر رہا ہو لیکن اس کے باوجود اس کا خیال بربادی میں بھٹک رہا ہو۔ پھر وہ یہی حرکت ہر روز کرے اور اسی حالت میں ناتوانی اور بڑھاپے کو پہنچ جائے۔ اسی طرح ایک شخص ہو تو خطیب، واعظ اور نصیحت کرنے والا لیکن وہ زبان سے وہ باتیں نکالے جن کا اس کے اپنے دل میں کوئی اثر نہ ہو۔ حکمت کی بصیرت کوئی دور کی چیز نہیں جس کے حاصل کرنے کے لیے کسی بڑی گہرائی، سوچ بچار اور علم کی ضرورت ہو مگر اس کے ساتھ ہی یہ تمام لوگوں میں پائی نہیں جاتی۔ اس کے مستحق بس اللہ کے وہ منتخب بندے ہیں جن کی خصوصیات اللہ تعالیٰ نے ایک سے زیادہ آیات میں بیان کی ہیں۔ اسی لیے فرمایا:

يُّؤْتِى الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِىَ خَيْرًا كَثِيْرًا — وہ جس کو چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے اور جسے حکمت ملی اسے خیر کثیر کا خزانہ ملا۔

(البقرۃ ۲ : ۲۶۹)

لہٰذا اگر کوئی شخص چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ حکمت تمام واضح چیزوں سے واضح تر اور بدیہی ہے۔ دل پر پردہ پڑ جائے تو آدمی کو اندھا بنا دیتا ہے۔ اس صورت میں نور کا کوئی قصور نہ ہوگا بلکہ قصور نگاہ کا ہوگا۔ قرآن مجید نے ایسے لوگوں کے احوال کئی آیات میں مختلف اسالیب سے واضح فرمائے ہیں۔ مثلاً:

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ — کیونکہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں۔

(حج - ۲۲ : ۴۶)

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی آیات کو نہیں دیکھتے تو ان کی آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ یہ ان کے دل ہوتے ہیں جو اندھے ہو جاتے ہیں۔

رسول اللہؐ کے فرائض میں تعلیم حکمت:

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ہمیں حکمت سے روشناس فرمایا ہے، اس کی عظیم قدر و منزلت بتائی ہے اور اس حقیقت کے بیان میں متعدد پہلوؤں سے رہنمائی دی ہے کہ حکمت، اللہ تعالیٰ کے سب سے بڑے انعاموں

میں سے ایک ہے۔ اس ضمن میں ایک اہم پہلو یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید کے چار مقامات پر جن چار صفات سے متصف کیا ہے ان میں آپ کی تعلیم کی انتہا تعلیم حکمت کو قرار دیا ہے۔ پہلا مقام وہ ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا یوں بیان فرمائی ہے:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ
(البقرۃ ۲: ۱۲۹)

اور اے ہمارے رب تو ان میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔

دوسرے مقام پر اس دعا کی قبولیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ
(البقرۃ ۲: ۱۵۱)

چنانچہ ہم نے تم میں ایک رسول بھیجا تم ہی میں سے جو تمہیں ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور تمہیں ان چیزوں کی تعلیم دیتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے

تیسرے مقام پر مومنین پر اپنا احسان بیان کرتے ہوئے فرمایا:

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ
(آل عمران ۳: ۱۶۴)

بے شک اللہ نے مومنین پر احسان فرمایا ہے کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا ہے، ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ بے شک یہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

چوتھے مقام پر لوگوں کو اس بات پر کہ انہوں نے اپنے رب کے عظیم فضل کی قدر نہیں پہچانی، متنبہ کرتے ہوئے فرمایا:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ

اسی نے اٹھایا ہے امیوں میں سے ایک رسول انہی میں سے، جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور

وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ
(جمعہ ۶۲: ۲-۴)

ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور بے شک یہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے اور انہی میں سے ان دوسروں میں بھی جو ابھی ان میں شامل نہیں اور اللہ غالب و حکیم ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے وہ بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

یہ چار مقامات اگرچہ تین مختلف سورتوں میں آئے ہیں لیکن ان کی عبارت ایک جیسی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ تزکیہ کا ذکر حضرت ابراہیمؑ کی دعا کے آخر میں ہوا ہے جبکہ باقی مواقع پر وہ پہلے ہے۔ اس تقدیم و تاخیر کا راز کیا ہے۔ اس کو تو ہم کسی مستقل فصل میں بیان کریں گے لیکن ان چار صفات کا تکرار ان کی زبردست اہمیت کی دلیل اور غور و فکر کا متقاضی ہے۔

جہاں تک تلاوت آیات کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو آیات نازل فرمائیں، جن کا آپ کو حکم دیا اور جن پر آپ کو اور آپ کی امت کو ابھارا، آپ ان کو آگے پہنچاتے۔ چنانچہ آپ کی امت کی مانند کلام اللہ کی تلاوت سے شغف رکھنے والی کوئی امت پہلے نہیں گزری۔ رہا تزکیہ تو یہ دین کا مقصود ہے۔ اس کی بنیاد توحید ہے اور توحید کا کمال اطاعت میں اخلاص اور خداوند تعالیٰ کی رضا کے لیے مال و جان کی قربانی ہے۔ یہ حقیقت ڈھکی چھپی نہیں کہ نفوس کے تزکیہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم جہاں تک پہنچے آپ سے پہلے کوئی دوسرا نبی وہاں تک نہیں پہنچا۔ آنحضرتؐ کی تیسری صفت تعلیم کتاب سے ان احکام شریعت کی تعلیم مراد ہے جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر واجب کیے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پوری تفصیل سے اپنے اصحاب پر واضح فرمایا، ان کے اصول و فروع کی طرف خود بھی رہنمائی دی اور اپنے فقہاء صحابہ کو بھی اس پر مامور فرمایا۔ چنانچہ وہ امت کے لیے نمونہ بن گئے۔ رہی حکمت تو آپ نے عقلوں کی تہذیب اور نفوس کے تزکیہ کے ذریعہ اس کی راہ بتلائی۔ لیکن کسی کو حکمت منتقل کرنے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کی بکثرت مشق کرائی جائے، فہم کے لیے روشنی مہیا کی جائے اور کتاب الٰہی میں غور و فکر پر برابر ابھارا جائے کیونکہ وہی حکمت کا سرچشمہ ہے۔ اس لیے اگرچہ بکثرت لوگ حکمت سے فیض یاب ہوئے لیکن اس کو آگے منتقل کرنے میں انہوں نے مشکل محسوس کی چنانچہ وہ اسے اس طرح منتقل نہ کر سکے جس طرح انہوں نے احکام شریعت کو منتقل کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ امت میں حکمت جاننے والے کم ہوئے اور اس کے حصول کا ذریعہ بھی مخفی رہ گیا۔

حکمت کے دوسرے نام :

جس طرح حکمت ایک بنیادی وصف ہے۔ جس کی کئی شاخیں اور کئی پہلو ہیں اور ان سب پر لفظ حکمت کا اطلاق ہوتا ہے اسی طرح حکمت کے کئی دوسرے نام بھی ہیں۔ جو شخص حکمت کے مفہوم کو سمجھتا ہو اسے فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں یہ نام استعمال کر کے حکمت کو مراد لیا گیا ہے۔ ایسے ناموں میں سے بعض نام یہ ہیں : ایمان، علم، حق، سکینت، روح، ہدی، بصیرت، نور، امانت، لُب، حظِ عظیم اور خیرِ کثیر۔

ایمان اصل حکمت ہے :

جس طرح لفظ حکمت نام ہے علم، حالت اور عمل کے مجموعے کا اسی طرح ایمان بھی ان سب کے مجموعہ کا نام ہے۔ حکمت کی بنیاد اور جڑ ربوبیت پر ایمان ہے کیونکہ ایمان ہی کے نتیجہ میں جب ایک بندۂ مومن خداوند تعالیٰ کی عبودیت کی طرف اپنے نفس کو مائل کرتا ہے تو اس سے اس کی ظلمت دور ہو جاتی اور محبت الٰہی کا نور اس کو ڈھانپ لیتا ہے۔ پھر بندہ اپنے رب کی رضا کے راستے کی جستجو کرتا ہے تو اسے تقویٰ حاصل ہوتا ہے تب وہ نیکی کے راستوں کو اختیار کرتا ہے۔ مخلوق کو وہ اس نظر سے دیکھتا ہے جس نظر سے ایک بھائی دوسرے بھائی کو دیکھتا ہے۔ اور یہ نگاہ شفقت و مہربانی کی نگاہ ہوتی ہے۔ اسلام کی حقیقت بھی یہی ہے۔ بندہ کو محبت الٰہی کے نتیجہ میں اطاعت اور فرمانبرداری حاصل ہوتی ہے اور فساد اور قطع رحمی جیسی برائیاں اس سے دور ہو جاتی ہیں۔ اسی چیز کو قرآن مجید میں یوں بیان فرمایا:

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓؤُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ
(البقرۃ ۲ : ۲۵۷)

اللہ ان لوگوں کا کارساز ہے جو ایمان لاتے ہیں۔ وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاتا ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کے کارساز طاغوت بنتے ہیں، وہ ان کو روشنی سے تاریکیوں کی طرف دھکیلتے ہیں۔

قرآن مجید نے کلمہ توحید کی تمثیل بھی بیان فرمائی ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ توحید کی جڑیں فطرت انسانی میں ہیں اور وہ تمام بھلائیوں اور نیکیوں کی طرف رہنمائی دیتی ہے۔ فرمایا :

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا

کیا تم نے غور نہیں کیا، کس طرح تمثیل بیان فرمائی ہے اللہ نے کلمہ طیبہ کی وہ ایک شجرہ طیبہ کے مانند

ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا
(ابراھیم ۱۴ : ۲۴)

ہے جس کی جڑ زمین میں اتری ہوئی ہے اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ اپنا پھل ہر فصل میں اپنے رب کے حکم سے دیتا رہتا ہے۔

ربیع بن انس کا قول ہے کہ آیت میں اصل ثابت سے مراد اللہ واحد کے لیے اخلاص اور اس کے شریک ٹھہرائے بغیر اس کی خالص عبادت ہے۔ شاخوں سے مراد نیکیاں ہیں۔ چنانچہ بندہ مومن کے اعمال دن کے آغاز اور انجام پر اوپر جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ شجرہ طیبہ اپنے رب کی توفیق سے ہر آن اپنا پھل دیتا ہے چنانچہ چار اعمال جن کو اگر بندہ جمع کر لے تو پھر فتنے اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے یہ ہیں : اللہ واحد کے لیے اخلاص، اس کی ایسی عبادت جس میں کسی کو شریک نہ ٹھہرایا گیا ہو، اس کی خشیت اور محبت اور اس کی یاد۔ اس قول میں فتنوں سے نقصان نہ پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ بندہ ایمان میں نہایت پختہ ہو جاتا ہے تو اس کے قدم کسی آزمائش یا دشمنوں کے غلبہ کے دوران ڈگمگاتے نہیں ہیں۔

جاننا چاہیے کہ تخلیق ایک حرکت کی مظہر ہے۔ ہر چیز کا عمل اس کی حرکت ہوتی ہے۔ ایک عمل دل کا ہے، ایک عقل کا اور ایک ہوا کا۔ ایک حرکت سے دوسری حرکت پیدا ہوتی ہے چنانچہ دل میں جو حرکت پیدا ہوتی ہے وہ فکر میں بھی ایک حرکت پیدا کرتی ہے۔ فکر کی یہ حرکت اعضا و جوارح کے مراکز کو متحرک کر دیتی ہے اور یہ مرکز بالآخر اعضاء و جوارح کو تحریک دیتے ہیں۔ جب یہ سب تحریکیں متفق ہو جاتی ہیں تو عمل کی قوتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ یہ موافقت اگر مستقل پائی جائے تو اصل (جڑ) اور فرع (ٹہنی) مضبوط ہوتی ہیں۔ دل کے اندر ایمان کے جڑ پکڑنے کی شکل ٹھیک یہی ہوتی ہے۔ ایمان کے اس پودے کو عمل صالح سیراب کرتا اور اس کو نشوونما دیتا ہے۔ اس مضمون کی طرف اشارہ آیت میں ہے۔

اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ
(فاطر ۳۵ : ۱۰)

اس کی طرف صعود کرتا ہے پاکیزہ کلام اور عمل صالح اس کلمہ کو سہارا دیتا ہے۔

اوپر والی آیت میں الفاظ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ (اس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں) میں اشارہ قرب الٰہی کی طرف ہے۔ بندہ اس فرع کی بدولت رب کی طرف بلند ہوتا ہے۔ جس بندے نے اپنا دین اللہ واحد کے لیے خالص کر لیا اور اس کی وحدانیت میں ہر قسم کا شک دل سے نکال دیا، لازم ہے کہ وہ پورے اخلاص سے اس کی بندگی کرے۔ بندگی میں خلوص اس وقت تک ممکن نہیں ہوتا جب تک کہ بندہ خدا کی خشیت نہ رکھتا ہو اور اس کا ڈرنا خدا کے ڈر کے تابع نہ ہو۔ پھر یہ بھی لازم ہے کہ بندے کی رغبت اور محبت خدا کے

(باقی صفحہ ۳۸ پر)

مقالات

خالد مسعود

سائنس کا صحیح طریقِ کار

مسلمانوں کے علاقوں پر مغربی اقوام کے تسلط کے دور میں مسلمان دانشوروں نے اسلامی تعلیمات کے بارے میں ایک معذرت خواہانہ رویہ اختیار کر لیا تھا۔ وہ ان کے جدید علوم سے اس قدر مرعوب ہوئے کہ اپنی کمزوری کا سبب اسلامی تعلیم کو سمجھا اور بعض ایسی بدیہی چیزوں کا انکار کر بیٹھے جو اگرچہ قرآن مجید سے ثابت تھیں لیکن مغرب کے عقلیت پسند ان کو نہیں مانتے تھے۔ جب سے مغربی اقوام کا استیلا ختم ہوا ہے اور مسلمانوں کو ان علوم سے خود بہرہ ور ہونے کا موقع ملا ہے جو پہلے صرف مغربی اقوام کی دسترس میں تھے، نہ صرف ان کے معذرت خواہانہ رویہ میں تبدیلی آئی ہے بلکہ گمان ہوتا ہے کہ وہ اب وہ دوسری انتہا کی طرف چل پڑے ہیں۔ اس کی ایک واضح علامت مسلمان سائنسدانوں کی یہ کوشش ہے کہ قرآن مجید کو سائنس کی ایک کتاب کی حیثیت سے سمجھا جائے حتیٰ کہ اس میں بیان کردہ اخلاقی قوانین پر بھی جدید سائنس کے طبعی قوانین کا اطلاق کر کے ان کی نئی توجیہات پیش کی جائیں۔ ہمارے نزدیک ان سائنس دانوں کا یہ جذبہ تو قابل قدر ہے کہ اب وہ اسلامی تعلیمات کے بارے میں کوئی معذرت خواہانہ رویہ اختیار نہیں کرنا چاہتے اور قرآن مجید کو اپنی رہنما کتاب کی حیثیت سے ماننا چاہتے ہیں لیکن قرآن مجید کو اس کی اپنی بتائی ہوئی حیثیت سے مختلف کوئی حیثیت دینا خطرے سے خالی نہیں۔

قرآن مجید انسان کی ہدایت کے لیے نازل ہوا۔ یہ ہدایت اس کی عقلی، فکری و اخلاقی تربیت کے لیے ہے۔ لہٰذا اس میں سب سے زیادہ وہ مسائل زیر بحث آئے ہیں جو فلسفہ، مابعد الطبیعیات، عمرانیات اور اخلاقیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان مسائل کا صحیح حل انسان کو اس ایمان و یقین اور اخلاق و کردار سے ہمکنار کر سکتا ہے جو زمین میں اللہ تعالیٰ کی خلافت کا حق ادا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ سائنس کے طبعی قوانین قرآن مجید کا اصل موضوع نہیں ہیں۔ سائنس ایک ایسا میدان ہے جس میں انسان اپنی دنیوی ضروریات کی تکمیل اور حاجات کے حصول کے لیے اپنے اندر زبردست داعیہ رکھتا ہے اور اس میں اس کی عقل کی رہنمائی کافی ہوتی ہے۔ مثلاً قدیم انسان

کی سب سے بڑی ضرورت اپنے لیے خوراک کا حصول تھا۔ اسی ضرورت نے اس کی عقل کو مہمیز دی اور اس نے پتھروں اور دھاتوں کے اوزار بنائے جن سے وہ شکار کر سکے یا زمین کو نرم کر کے اس میں اپنی ضرورت کی فصل کاشت کر سکے۔ اس تعلیم کے لیے کسی آسمانی صحیفے کی ضرورت نہ تھی۔ جوں جوں اس کا مشاہدہ اور تجربہ بڑھتا گیا وہ اس سائنس میں ترقی کرتا گیا۔ آج کے انسان کی زندگی تیز رفتار ہے اور اسے کمپیوٹر جیسے آلات ایجاد کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے تو اس نے اپنی عقل سے بڑے سے بڑا کمپیوٹر تیار کر لیا ہے کیونکہ ایسا کرنے کا داعیہ وہ اپنے اندر پاتا تھا۔ انسان نے مادی ترقی کی تمام منزلیں کسی صحیفۂ آسمانی کے بغیر طے کی ہیں۔

سائنس کی مادی تعلیم کبھی انبیائے کرام کے فرائض منصبی میں شامل نہیں رہی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض قرآن مجید کی متعدد آیات میں نہایت وضاحت سے بیان ہوئے ہیں۔ ان کے مطابق آپ کی ذمہ داری وحی آسمانی کو لوگوں تک پہنچانا، ان کو احکام شریعت اور حکمت کی تعلیم دینا اور ان کے اخلاق و کردار کا تزکیہ کرنا تھا۔ مادی علوم کی تعلیم آپ کی ذمہ داری نہ تھی۔ اس بات کو آپ نے واضح طور پر بیان بھی کیا۔ آپ کا گزر ایک نخلستان پر ہوا۔ آپ نے دیکھا کہ لوگ کھجور کے بعض درختوں کا بور دوسرے کھجوروں پر ڈال رہے ہیں۔ آپ نے اس کا سبب پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ اس طرح پھل زیادہ آتا ہے۔ آپ نے فرمایا اگر تم ایسا نہ کرو تو کوئی حرج نہ ہو گا۔ لوگوں نے حکم کی تعمیل کی۔ اگلے سال پھل کم آیا تو لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بتایا کہ پیداوار میں پیداوار میں کمی واقع ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا اپنے تجربہ پر عمل کرو، تم دنیوی امور میں مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔

کھجوروں کا یہ واقعہ جو حدیث کی کتابوں میں تأبیرِ نخل کے واقعہ کے نام سے بیان ہوا ہے ایک خالص سائنسی عمل سے متعلق ہے۔ نر اور مادہ کھجوروں کے بُور کا ملاپ بار آوری کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ عام حالات میں قدرتی عوامل مثلاً ہوا، پرندے اور حشرات بُور کی منتقلی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ مدینہ منورہ کے کسان یہ کام خود کرتے تھے اور بار آوری مکمل ہوتی تھی۔ یہ ایک سائنسی مشاہدہ اور تجربہ کا معاملہ تھا۔ آنحضرتؐ کا خیال مبارک یہ تھا کہ اسے قدرتی عوامل پر ہی منحصر رہنا چاہیے لیکن ایسا کرنے سے پیداوار میں کمی واقع ہو گئی تو آپ نے اپنی رائے پر اصرار نہیں فرمایا اور ہدایت دی کہ دنیوی امور میں لوگوں کا علم آپ سے زیادہ ہے اس لیے وہ اپنے علم و تجربہ کے مطابق عمل کریں۔

اس امر کے باوجود کہ قرآن مجید سائنس کی کتاب نہیں ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآن نے بیسیوں سائنسی حقائق بیان کیے ہیں اور یہ حقائق ہیں بھی ایسے کہ مادی سائنس صدیوں کی مسافت طے کر کے وہاں تک پہنچی ہے۔ اس حقیقت کو جدید سائنس دانوں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ فرانس کے ایک ڈاکٹر موریس بوکائے (MAURICE BUCAILLE) جن کو قرآن کے اس پہلو نے اتنا متاثر کیا کہ وہ اسلام لے آئے، اپنی

کتاب "قرآن، بائبل اور سائنس" میں یہ اقرار کرتے ہیں کہ سائنسی دوائر میں قرآن مجید کا کوئی بیان ایسا نہیں جس کو موجودہ ترقی یافتہ سائنس جھٹلا سکے۔ ہر بات نہایت محکم ہے اور کتنی ہی باتیں ایسی ہیں کہ سائنس بعد از خرابیٔ بسیار ان تک اب آکر پہنچی ہے۔

سائنسی حقائق پر مشتمل آیات پر ایک مجمل نظر بھی یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ یہ ان آیات میں بیان ہوئے ہیں جن کو قرآن مجید اپنے دلائلِ آفاق قرار دیتا ہے۔ یعنی ایسی دلیلیں جو کائنات کے گوشے گوشے میں پھیلی ہوئی ہیں اور ہر شخص برابر ان کا مشاہدہ کرتا ہے۔ قرآن مجید کے مباحث کے تین بڑے دائرے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، دنیوی زندگی کے اختتام پر حیاتِ اخروی کا وقوع اور ہدایتِ انسانی کے لیے رسالت کا منصب۔ آفاقی دلائل اصلاً انہی مباحث کی تکمیل کے لیے آئے ہیں۔ انسان سے یہ تقاضا کیا گیا ہے کہ وہ ان دلائل پر غور کر کے ان نتائج تک رسائی حاصل کرے جن کی طرف قرآن مجید رہنمائی دیتا ہے۔ یہ امر کہ یہ آفاقی دلائل کس بات کو ثابت کرنے کے لیے بیان کیے گئے ہیں، ان آیات کے سیاق و سباق سے واضح ہوتا ہے جن میں یہ آئے ہیں۔ گویا نظمِ قرآن ان کے مدلول پر روشنی ڈالتا ہے۔

سائنسی طریق کار یہ ہے کہ حواس کے ذریعے حاصل ہونے والے شواہد سے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں اور ان نتائج کی صحت کو جانچنے کے لیے تجربات کیے جاتے ہیں۔ جب تجربات سے ان نتائج کی تائید ہو جائے تو ان کو ایک اصول کی حیثیت سے مان لیا جاتا ہے اور اس اصول کو مادی ترقی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس طرح سائنس سمع و بصر کو مشاہدات و تجربات میں اور عقل کو نتائج کے استنباط میں استعمال کرتی ہے۔ قرآن مجید جب دلائلِ آفاق کا تذکرہ کرتا ہے تو سمع و بصر اور عقل ہی کے استعمال کا تقاضا نہیں کرتا بلکہ تذکر، تفقہ اور عبرت پذیری کا بھی مطالبہ کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید ایک سائنس دان کے اس طریق کار کو کافی قرار نہیں دیتا جو وہ موجودہ سائنس کی رو سے اختیار کرتا ہے بلکہ اس کو آگاہ کرتا ہے کہ حسی مشاہدہ سے مادی قسم کے فوائد حاصل کرنے پر ہی وہ اکتفا نہ کرے بلکہ تذکر، تفقہ اور عبرت پذیری کی صلاحیتیں استعمال کر کے اپنی جولان گاہ مابعد الطبیعیاتی دائروں تک وسیع کرے۔

تذکر کے معنی یاددہانی حاصل کرنا ہے۔ آدمی کسی حقیقت کو بھولا ہوا ہو اور کسی دوسری چیز کے مشاہدہ سے وہ چونک جائے۔ اور اس بھولی بسری حقیقت پر متنبہ ہو جائے تو یہ تذکر ہے۔ قرآن مجید انسان کو جس علم سے آگاہ کرتا ہے اس علم کی تمام اساسات انسان کی فطرت میں ودیعت ہیں۔ لیکن دنیا کی دلچسپیوں میں کھو کر وہ ان کو بھول جاتا ہے لیکن چونکہ صحیح علم انسان کی فلاح کے لیے ضروری ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو متنبہ کرنے کے لیے قدم قدم پر ایسے شواہد پیدا فرما دیے ہیں۔

جن سے اس کو تذکر ہو۔ سورہ اعراف آیت ۱۳۰ کے مطابق قوم فرعون کو تنبہ نہیں ہو رہا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو قحط سالی اور پیداوار کی کمی سے دوچار کیا تاکہ اس کی آنکھیں کھلیں۔ سورہ توبہ آیت ۱۲۶ کے مطابق بندوں کو سال میں ایک دو مرتبہ آزمائش میں مبتلا کیا جاتا ہے تاکہ وہ حقیقت کو بھلانہ بیٹھیں اور انہیں تذکر ہو۔ سورہ دہر آیت ۲۰ کی رو سے اسی تذکر کے لیے قرآن مجید نے ہر اہم بات کو سمجھانے کے لیے تمثیلات بیان فرمائی ہیں۔ نظامِ فطرت کے مشابہات کو بیان کرتے ہوئے بھی یہ توقع ظاہر کی گئی ہے کہ سائنس دان ان سے تذکر حاصل کریں گے یعنی ان کی نگاہیں محض مادی فوائد پر مرتکز نہیں ہو جائیں گی بلکہ وہ ان سے ایسے حقائق تک رسائی پائیں گے جن کا علم تو ان کی فطرت میں پنہاں ہے مگر وہ اس کو بھولے ہوئے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ

اور پہلی پیدائش کو تو تم جانتے ہی ہو تو اس سے کیوں یاددہانی حاصل نہیں کرتے۔

(واقعہ ۵۶: ۶۲)

یعنی انسان کی اولین پیدائش ہی میں دلیلیں پنہاں ہیں۔ اس پر قیاس کر کے حیاتِ اخروی کے امکانات کیوں تمہاری سمجھ میں نہیں آتے

اسی طرح فرمایا۔

وَمِن كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ

اور ہر چیز سے ہم نے پیدا کیے جوڑے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو۔

(ذاریات ۵۱: ۴۹)

ایک سائنس دان نر و مادہ کے جوڑوں کے مطالعہ تک اپنی جستجو کو محدود کر لیتا ہے لیکن یہاں یہ سبق دیا ہے کہ یہ قانون دوسری چیزوں میں بھی جاری و ساری ہے۔ حقائق تک رسائی کے لیے ان کو بھی اسی نقطہ نظر سے دیکھو۔ دنیا کی زندگی میں بھی ایسے خلا ہیں جن کے باعث یہاں عدل کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ آخرت اس کمی کو پورا کرنے والی ہے لہٰذا دنیا کو اس جوڑے کے ساتھ ملا کر دیکھو تو تمہیں اصل حقیقت کا ادراک ہو سکے گا۔

تفقہ کے عام معنی تو کسی بات کو اچھی طرح سمجھ لینے کے ہیں لیکن قرآن مجید کے استعمالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک تو یہ لفظ دل کے اس فعل کو بیان کرنے کے لیے آتا ہے جو آدمی کے اندر جذبات و احساسات پیدا کرتا ہے، جبکہ عقل کے فعل کو علم سے تعبیر کیا ہے۔ دوسرے تفقہ میں کسی بات کو سمجھنے کی وہ کیفیت ہوتی ہے جس میں آدمی کی نگاہیں صرف ظاہر کو نہ دیکھ رہی ہوں۔ بلکہ معاملات کی تہ تک پہنچیں اور اصل

حقیقت کا ادراک کریں۔ مثلاً غزوہ بنی المصطلق کے دوران منافقین نے یہ نعرہ بلند کیا کہ ہم مدینہ لوٹ کر مہاجرین پر کچھ خرچ نہیں کریں گے۔ اس پر فرمایا:

وَلِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ — اور اللہ ہی کے ہیں آسمانوں اور زمین کے خزانے لیکن منافقین نہیں سمجھتے۔

(المنافقون ۶۳: ۷)

یعنی منافقین کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ مہاجرین ان کے انفاق کے سہارے پر زندہ ہیں۔ اصل میں یہ اس حقیقت کے شعور سے عاری ہیں کہ رزق کے تمام خزانے اللہ کے پاس ہیں، ان کی کنجیاں منافقین کے پاس نہیں ہیں۔ اسی طرح مشرکین کے ساتھ جنگ کی صورت میں قرآن مجید نے یہ خبر دی کہ ایک سو ثابت قدم مسلمان ان مشرکین کے ایک ہزار پر غالب آئیں گے کیونکہ مشرکین اس شعور سے عاری ہیں جو مسلمانوں کو اسلام لانے کے بعد حاصل ہو چکا ہے۔ ان کی ظاہر بین نگاہیں صرف مادی وسائل کو دیکھتی ہیں جبکہ اصل فیصلہ کن چیزیں دوسری ہیں۔ آیت کے الفاظ ہیں بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (انفال ۸: ۶۵)

لفظ فقہ کے ان مفہوموں کی روشنی میں جب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید شواہد کائنات کو بیان کر کے فرماتا ہے کہ

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ — ہم نے اپنی نشانیاں ان لوگوں کے لیے تفصیل سے بیان کر دی ہیں جو سمجھیں۔

(انعام ۶: ۹۸)

تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک سائنس دان کو یہ بتایا گیا ہے کہ وہ ظاہر کے پردوں کے پیچھے جھانک کر ہر معلول کی اصل علت کو دریافت کرے اور محض ایک مشینی آدمی کی طرح کام کرنے کے بجائے اپنے جذبات و احساسات کو تحریک دے کر حقیقت کا شعور حاصل کرے۔

لفظ 'عبرة' کا مفہوم کسی واقعہ سے سبق حاصل کرنا ہے۔ اس میں آدمی مشاہدہ سے حاصل ہونے والے علم کے ذریعے اس کے گہرے معانی تک جست لگاتا ہے، بعض واقعات کی ترتیب سے ان قوانین کو سمجھتا ہے جو ان واقعات کو وجود میں لانے کا سبب بنے۔ مثلاً ماضی کی بعض قوموں کی بربادی کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ اہل عقل کے لیے اس میں وہ سبق پوشیدہ ہیں جن سے وہ سنن الٰہیہ کو سمجھ سکتے ہیں:

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ — ان کی سرگزشتوں میں اہل عقل کے لیے بڑا سامان عبرت ہے۔

(یوسف ۱۲: ۱۱۱)

یہاں لفظ عبرة ان مشاہدات کے لیے استعمال ہوا ہے جو ہمیں اپنے گرد و پیش میں ہوتے ہیں مثلاً فرمایا:

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ — اور بے شک تمہارے لیے چوپایوں میں بھی بڑا سبق ہے۔ ہم ان کے پیٹوں کے اندر کے گوبر اور خون کے درمیان سے تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار۔

(نحل ۱۶: ۶۶)

مطلب یہ ہے کہ اس مشاہدہ سے اس حیرت انگیز قدرت کا ادراک کرو جو رب کائنات کی ہے اور جانو کہ وہ کس طرح ناقابل فہم طریقوں سے ایسے نتائج حاصل کرتا ہے جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔ موجودہ سائنس مویشیوں کے اندر دودھ بننے کے نظام کو دیکھ کر اس جستجو میں لگ جاتی ہے کہ وہ کون سے کیمیائی عوامل ہیں جو خوراک کو دودھ میں تبدیل کرتے ہیں۔ خوراک پر کون سے خارجی اثرات اثر انداز ہو کر یہ اثر پیدا کرتے ہیں لیکن قرآن کی رو سے ایک سائنس دان کو اس مشاہدہ سے جست لگا کر قدرت خداوندی کا ادراک کرنا چاہیے۔ جو لوگ عبرت پذیری کی صلاحیت کو مردہ کر دیتے ہیں ان کے عقل و دل کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ وہ دیکھتے سب کچھ ہیں لیکن ان کو سوجھتا کچھ بھی نہیں۔

سورہ جاثیہ کے آغاز میں قرآن مجید نے کائنات کے بہت سے ایسے شواہد کا ذکر کیا ہے جو سائنس کی جستجو کا محور بنتے ہیں مثلاً آسمان اور زمین کا نظام، انسانوں اور حیوانوں کی تخلیق، رات اور دن کی گردش، ہواؤں کی گردش اور زمین پر بارش کے اثرات۔ ان شواہد کے بیان کے بعد فرمایا

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ — یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم تمہیں بالکل حق کے ساتھ سنا رہے ہیں۔

(جاثیہ ۴۵: ۶)

اس آیت کی تفسیر میں مولانا امین احسن اصلاحی نے تفسیر تدبر قرآن میں لکھا ہے کہ:

"نتلوها عليك بالحق" میں 'بِالْحَقِّ' سے مراد وہ قطعی اور حقیقی نتائج ہیں جو ان نشانیوں پر غور کرنے سے سامنے آتے ہیں۔ یہ قید اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ جہاں تک ان نشانیوں پر غور کرنے کا تعلق ہے ان پر غور تو دوسرے بھی کرتے ہیں لیکن وہ اپنے مخصوص اور نہایت محدود زاویہ سے غور کرتے ہیں۔ اس وجہ سے یا تو ان حقائق تک پہنچ نہیں پاتے جو ان کے اندر مضمر ہیں یا پہنچتے تو ہیں لیکن چونکہ وہ ان کے نفس کی خواہشوں کے خلاف ہیں اس وجہ سے ان کے اعتراف سے گریز کرتے ہیں مثلاً آسمان و زمین کی نشانیوں پر فلکیات وارضیات

کے ماہرین بھی غور کرتے ہیں۔ انسان کی خلقت پیاناتومی والے بھی تحقیق کرتے ہیں۔ حیوانات کے مختلف پہلوؤں پر علم الحیوانات والے بھی سر کھپاتے ہیں، رات اور دن کی گردش، بارشوں کے اوقات واثرات اور ہواؤں کے تغیر وتبدل پر موسمیات والے بھی بہت کچھ ہوا باندھتے ہیں لیکن ان سب کا حال ان کی تنگ نظری کے سبب سے یہ ہے کہ یہ اپنی دور بینوں اور خوردبینوں سے تل کو تو دیکھ لیتے ہیں لیکن تل کے اوٹ کا پہاڑ ان کو نظر نہیں آتا۔ موسمیات والے یہ پیشگوئی تو کردیں گے کہ آگے چوبیس گھنٹے موسم گرم وخشک رہے گا اور اس کی کوئی الٹی سیدھی توجیہ بھی کردیں گے۔ اکثر حالات میں ان کی پیشگوئی صحیح بھی ثابت ہوتی ہے اور بعض حالات میں ان کی پیش کردہ توجیہ سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن ان کی نگاہ صرف ہواؤں کے تصرف کی نوعیت اور اس کے اثرات کا اندازہ کرنے تک محدود رہ جاتی ہے' اس سے آگے بڑھ کر وہ اس سوال پر غور کرنے کی زحمت نہیں اٹھاتے کہ ان تصرفات کے پس پردہ حقیقی متصرف کون ہے اور اس کے حقوق وفرائض کیا ہیں! حالانکہ کائنات کے اندر یہ تمام تصرفات وتغیرات جو ہوتے ہیں یہ اسی لیے ہوتے ہیں کہ انسان اس اصل سوال تک پہنچے، اس کا حل دریافت کرے اور اگر خدا کا کوئی بندہ اس کو اس سوال کا کوئی دل نشین حل بتائے تو اس کو قبول اور اس پر عمل کرے۔ قرآن نے ان نشانیوں کے انہی پہلوؤں کو خاص طور پر بے نقاب کیا ہے جو اصل حقیقت پر روشنی ڈالنے والے ہیں اس وجہ سے اس کو نتلوھا علیک بالحق سے تعبیر فرمایا ہے"

(تدبر قرآن ششم طبع اول صفحہ ۳۰۶ - ۳۰۷)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اس کے باوجود کہ قرآن سائنس کی کتاب نہیں اس نے اپنے بہت سے دلائل کی بنیاد ایسی چیزوں کے مشاہدہ پر رکھی ہے جو سائنس کا موضوع ہیں لیکن اس مشاہدہ کو اس نے محض ایک سمعی وبصری عمل قرار نہیں دیا بلکہ یہ تحریک دی ہے کہ سمع وبصر کے حواس کے پہلو بہ پہلو تعقل تذکر، تفقہ اور عبرت پذیری کو بھی جگہ دی جائے تاکہ یہ مشاہدہ اصل حقائق تک انسان کو پہنچائے۔ اگر سائنس دان قرآن مجید کی اس ہدایت کو ملحوظ رکھیں تو سائنس مذہب واخلاق سے اس طرح بے بہرہ نہ ہو جیسی اب ہے۔ اس ہدایت کو نظر انداز کرنے ہی کا یہ نتیجہ آج سامنے آرہا ہے کہ سائنس لامذہبیت کی علامت سمجھی جاتی ہے اور اس کی ایجادات نے انسان کے سر پر ایک تلوار لٹکا رکھی ہے۔ کسی کو یہ معلوم نہیں کہ کب یہ تلوار انسان ہی کا خاتمہ کردے۔

تکبر

انسان کی طبیعت کا فساد اس کے اندر کئی قسم کی چھوٹی بڑی کمزوریاں پیدا کر دیتا ہے لیکن بعض کمزوریاں نہایت ہلاکت خیز ہوتی ہیں اور اسی بنا پر ان کا شمار بہت بڑے اخلاقی گناہوں میں ہوتا ہے۔ اس قبیل کی انسان کی عقلی اور اخلاقی بیماریوں میں مہلک ترین بیماری تکبر کی ہے جس کو نبیؐ نے مہلکات میں شامل فرمایا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

واما المهلكات فهوى متبع وشح مطاع واعجاب المرء بنفسه وهو اشدهن

رہیں تین مہلک چیزیں تو ان میں سے ایک خواہشات کی پیروی ہے۔ دوسری بخل کی اطاعت اور تیسری آدمی کا خود اپنے اوپر فریفتہ ہونا اور یہ چیز ان تینوں میں سب سے زیادہ سخت ہے۔

تکبر کیا ہے؟ اس کے بارہ میں کئی معیار مقرر کئے جاسکتے ہیں لیکن ہمارے خیال میں تکبر کی جو تعریف خود نبیؐ نے ایک سوال کے جواب میں نہایت واضح طور پر فرما دی ہے وہ تکبر کے مفہوم کو نہ صرف نہایت عمدہ طریقہ سے بیان کرتی ہے بلکہ اس کی علامات بھی بیان کرتی ہے۔

عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے:

قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يدخل الجنة من كان فى قلبه مثقال ذرة من كبر فقال رجل ان الرجل يحب ان يكون

انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں نہیں داخل ہوگا۔ ایک شخص نے سوال کیا کہ آدمی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں، اس کا جوتا اچھا ہو

ثوبه حسنا و نعله حسنة فقال ان الله جميل و يحب الجمال، الكبر بطر الحق و غمط الناس۔

تو کیا یہ بھی تکبر ہے آپ نے فرمایا کہ اللہ خود صاحب جمال ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ تکبر یہ ہے کہ حق کا انکار کرے اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ تکبر اس اخلاقی کمزوری کا نام ہے جس میں آدمی اپنے آپ کو اتنا اونچا سمجھنے لگتا ہے کہ دوسرے سب لوگ اسے ہیچ نظر آنے لگتے ہیں اور اپنی رائے اس کی نظروں میں اتنی وقیع ہو جاتی ہے کہ اگر اس کے سامنے حق بھی پیش کیا جائے تو وہ اسے خاطر میں لانے کو تیار نہیں ہوتا۔

تکبر ابلیس کی صفت ہے:

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تکبر وہ جرم ہے جس کا مرتکب ابلیس ہوا اور اس کے نتیجہ میں وہ خداوندکریم کے فضل سے محروم قرار دیا گیا۔ جب اللہ تعالیٰ کی مشیت کا یہ تقاضہ ہوا کہ وہ زمین میں ایک بشر کو اپنا خلیفہ بنا کر بھیجے اور اس بشر کی تخلیق مٹی کے عناصر سے کی جائے تو اس نے ملائکہ اور جنات کو یہ حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں۔ انہوں نے خداوند تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی لیکن ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کردیا اور جب اس سے سجدہ نہ کرنے کا سبب دریافت کیا گیا تو اس نے کہا: اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِىْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (اعراف ۱۲) میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا ہے)

گویا شیطان کی سرکشی کی بنیاد تکبر پر تھی۔ اس کا خیال ہوا کہ شرف و عزت کا تعلق نسل و نسب سے ہے اور اس اعتبار سے وہ انسان سے اشرف ہے۔ وہ آگ سے پیدا ہوا ہے اور آدم مٹی سے پیدا ہوا ہے اس نے اس حقیقت کو نہیں سمجھا کہ اصل شرف تو رب کی اطاعت میں ہے۔ چنانچہ اس تکبر کی بنا کر اسے راندۂ درگاہ قرار دے دیا گیا۔ قرآن مجید نے ابلیس کے واقعہ سے ہمیں یہ رہنمائی دی ہے کہ شرف و عزت کو نسل و نسب سے متعلق سمجھنا ابلیس کی ایجادات میں سے ہے اور جہاں کہیں بھی یہ موجود ہے یہ اس کی وراثت کی حیثیت سے موجود ہے۔ اللہ کے ہاں جو چیز سبب عزت و سرخروئی ہے وہ صرف اللہ کے حکم کی اطاعت ہے۔ اس کے سوا کوئی چیز بھی خدا کے ہاں عزت پانے کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔

تخلیق انسانی کے اس ابتدائی دور میں ایک گناہ آدم سے بھی سرزد ہوا اور انہوں نے وہ پھل

کھا لیا جس کے کھانے سے اللہ تعالیٰ نے ان کو بطور خاص منع فرمایا تھا۔ یہ معاملہ اگرچہ خدا کی نافرمانی کا تھا اور اس کے سبب آدم کو جنت سے بھی نکلنا پڑا لیکن اس گناہ میں وہ سنگینی نہ تھی جو ابلیس کے تکبر کے گناہ میں تھی۔ یہ آدم کے ضعف ارادہ سے پیدا ہوا تھا۔

انسان سے جو گناہ محض ارادہ کی کمزوریوں سے صادر ہوتا ہے اس کا مزاج اس گناہ سے بالکل مختلف ہوتا ہے جس کا سرچشمہ حسد اور تکبر ہوتا ہے۔ ضعف ارادہ سے صادر ہونے والے گناہ کے بعد توبہ اور اصلاح کی توقع بہت غالب ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو اگر وہ بالکل ہی اپنے آپ کو چھوڑ نہیں بیٹھے ہیں سنبھالتا ہے اور ان کی رہنمائی صراط مستقیم کی طرف کرتا ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ حسد اور تکبر کی بنا پر خدا کی نافرمانی کرتے ہیں ان کی بیماری بہت سخت ہوتی ہے ایسے لوگ اصلاح پذیر ہونے کے بجائے بالعموم اپنے مرشد ابلیس ہی کی راہ پر جیتے اور اسی پر مرتے ہیں۔ حضرت آدمؑ کا گناہ پہلی قسم کا تھا اس وجہ سے ان کو توبہ کی توفیق حاصل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف فرما دیا۔ ابلیس کا گناہ دوسری قسم کا تھا اس وجہ سے وہ توبہ اور اصلاح سے محروم رہا اور اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوئی۔

انبیاؑ کی مخالفت میں متکبرین پیش پیش رہے:

قرآن مجید نے انبیائے کرام اور ان کی قوموں کی جو تاریخ بیان کی ہے اس میں جگہ جگہ اس بات کو نمایاں کیا ہے کہ انبیاء کے انکار میں سب سے پہلے ان کی قوموں کے اسی طبقہ نے سبقت کی جو تکبر میں مبتلا تھا۔ ان لوگوں کو اول تو یہی بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی تھی کہ خدا کی کسی نعمت کا مستحق ان کے اندر سے کوئی ایسا شخص قرار پائے جو مالدار اور صاحب اقتدار نہیں ہے اور اگر اس بات پر کسی طرح وہ اپنی طبیعت کو راضی بھی کر سکتے تھے تو پھر اس بات کو برداشت کرنا ان کے لئے ناممکن ہوتا تھا کہ پیغمبر کے غریب ساتھیوں کو اپنا ساتھی اور ہمنشیں اور ان کی صحبت میں برابر کے شریک کی حیثیت سے بیٹھیں۔ معلوم ہوا کہ قبول حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تکبر ہے اور متکبر آدمی پر حق کی راہ کھلنے کا امکان سب سے کم ہوتا ہے۔

تکبر کا اظہار آدمی محض اپنی ذاتی اور شخصی حیثیت میں ہی نہیں کرتا بلکہ جماعتی طور پر بھی اس کا مظاہرہ کرتا ہے۔ قوموں اور قبیلوں کا اپنے آپ کو دوسری قوموں اور قبیلوں سے اونچا سمجھنا تکبر کی اجتماعی قسم ہے اس سے قومی تفاخر، گروہی عصبیت، نسلی اور جماعتی برتری کا زعم پیدا ہوتا ہے اور یہ قوموں کے لئے

قبول حق کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ جو گروہ اس بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے اس کے لئے اس حق کے سوا جس کو وہ حق قرار دے دے کسی اور حق کو قبول کرنا ناممکن ہو جاتا ہے اس کے نتیجہ میں اس گروہ کے اندر ایسا حسد پیدا ہو جاتا ہے جو ہر اس حق سے نفرت اور چڑ پیدا کر دیتا ہے جو اس کی خواہش کے خلاف ہوتا ہے۔

یوں تو تمام انبیائے کرام کو متکبرین سے سابقہ پیش آیا جنہوں نے حق کی آواز اپنے لئے خطرہ سمجھتے ہوئے انبیاءؑ کی دعوت کو رد کر دیا اور قرآن مجید میں مختلف لوگوں کے حوالے سے اس کی متعدد مثالیں دی گئی ہیں لیکن ایک نہایت عبرت انگیز مثال اس گروہ کی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی تھی اس کے پاس خدا کی رہنما کتاب تھی اس کے اندر انبیاء مبعوث ہوتے رہے لیکن اس کے باوجود حق ان کے دلوں میں گھر نہ کر سکا۔ یہ گروہ یہود کا ہے۔ یہود اس غرور میں مبتلا ہیں کہ وہ اسرائیل کی اولاد اور خدا کے محبوب اور چہیتے ہیں۔ اس وجہ سے مذہبی پیشوائی ان کا اجارہ ہے۔ یہود اپنے اس غرور کے سبب اول تو اپنے خاندان سے باہر کسی کی نبوت اور رسالت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہی نہیں تھے اس وجہ سے آنحضرتؐ کے شروع ہی سے مخالف تھے۔ قرآن مجید نے ان کے دماغ سے یہ ہوا نکالنے کے لئے یہ حقیقت واضح فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کا استحقاق کسی قوم کو کبھی نسل و نسب کی بناء پر حاصل نہیں ہوتا بلکہ ایمان و عمل صالح کی بناء پر حاصل ہوتا ہے اور اس پر خود ان ہی کی تاریخ کی شہادت پیش کر کے واضح کیا ہے کہ جب یہود نے اپنی اصلاح کی تو ان پر خدا نے رحمت کی اور جب فساد مچایا تو خدا نے ان پر عذاب کے کوڑے برسائے۔ انہیں بتایا ہے کہ خود تمہارے صحیفوں میں ہے کہ تم دو مرتبہ بڑے پیمانہ پر خدا سے بغاوت کرو گے اور زمین میں فساد مچاؤ گے اور دونوں مرتبہ خدا تم پر اپنے سخت گیر بندے مسلط کرے گا جو تمہارا کچومر نکال دیں گے چنانچہ یہ پیش گوئیاں حرف بحرف پوری ہوئیں۔ ایک مرتبہ بخت نصر نے یروشلم پر حملہ کر کے اس کو تاخت و تاراج کیا اور دوسری مرتبہ رومیوں نے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجائی۔ اس کے باوجود یہود کے دماغ سے یہ غرور نکل نہیں سکا بلکہ اس زمانہ میں بھی ان کا دعویٰ یہی ہے کہ وہ خدا کا ایک منتخب گروہ ہیں اور ان کے ساتھ خدا کا معاملہ دوسری تمام اقوام سے بالکل الگ ہے کیونکہ اسرائیل کا گھرانہ خداوند کا اپنا گھرانہ ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کی بعثت بنی اسرائیل کی طرف ہوئی تھی اور آپ کے آنے کی منادی خدا کے پیغمبر حضرت یحییٰ پہلے سے کر چکے تھے لیکن جب سیدنا مسیح علیہ السلام نے یہود کو دین کی دعوت دی

تو ان کے زمانہ کے ارباب اقتدار اور مسند نشینوں نے ان کی باتوں کو اس وجہ سے قبول نہیں کیا کہ اس سے ان کی علمی و سیاسی برتری کا پندار مجروح ہوتا تھا حتیٰ کہ آپ کو ماہی گیروں کی بستی میں جا کر ان سے کہنا پڑا کہ اے مچھلیاں پکڑنے والو! آؤ میں تمہیں انسانوں کو پکڑنے والا بناؤں اور وہیں سے انہیں اعوان و انصار ملے کیونکہ ان کے دل تکبر سے خالی تھے۔ بعینہ یہی چیز قریش کے اکابر کے لئے اس وقت حجاب بنی جب آنحضرتؐ کی بعثت ہوئی۔ وہ کہتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ نبوت کے منصب پر کسی کو سرفراز کرنے والا ہی ہوتا تو مکہ یا طائف کے کسی رئیس کو اس منصب پر سرفراز کرتا۔ مدینہ کے یہود نے آنحضرتؐ کے ساتھ اسی طرح کا برتاؤ رکھا جیسا انہوں نے سیدنا مسیحؑ کے ساتھ رکھا تھا۔ البتہ نصاریٰ میں سے بہت سے لوگ ایمان لے آئے ان کی تعریف کرتے ہوئے قرآن مجید نے یہ بات بطور خاص بیان فرمائی ہے کہ وہ تکبر میں مبتلا نہیں تھے۔

ذٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ	یہ اس وجہ سے کہ ان کے اندر عالم اور راہب ہیں اور یہ تکبر نہیں کرتے۔

(مائدہ ۸۲)

انبیاء علیہ السلام کے علاوہ دوسرے مصلحین اور داعیان حق کو بھی یہی صورت حال پیش آئی ہے ان کی پیش کی ہوئی صداقتوں کو سب سے پہلے ان ہی لوگوں نے جھٹلایا ہے جو استکبار کے فتنہ میں مبتلا ہیں۔ آج تک جتنے مصلح اور داعی حق پیدا ہوئے ہیں اگر ان کے حالات جمع کئے جائیں تو یہ چیز بطور قدر مشترک اس میں ملے گی کہ اللہ کے بندوں کے لئے اللہ کی راہ کھولنے کی انہوں نے جو کوشش کی اس میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ متکبرین ہی بنے۔ انہوں نے نہ تو خود اس راہ پر چلنا پسند کیا اور نہ ہی جہاں تک ان کا بس چلا انہوں نے دوسروں کو اس راہ پر چلنے دیا۔

تکبر کے اسباب

انکار آخرت اور خوشحالی:

کسی فرد یا کسی جماعت کو دنیا میں جو آسائشیں اور نعمتیں حاصل ہوتی ہیں تو وہ یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ یہ اس کا حق ہے اور چونکہ اس جیسے دوسرے انسانوں کو یہ سب میسر نہیں اس لئے وہ اس گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہے۔ سورہ مومنون میں اللہ تعالیٰ نے اس ذہنیت پر روشنی ڈالی ہے۔

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِلِقَاءِ الْآخِرَةِ
وَأَتْرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ ۙ
يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ ۙ (مومنون ۳۳)

اور اس قوم کے اعیان نے جنہوں نے کفر کیا اور آخرت کی پیشی کو جھٹلایا اور ان کو دنیا کی زندگی میں رفاہیت دے رکھی تھی کہا کہ یہ تمہارے ہی مانند ایک بشر ہے وہی کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو اور وہی پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔

یعنی یہ کہ مستکبرین کے طغیان اور رعونت کے اصل اسباب میں سے پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ آخرت اور آخرت میں خدا کے آگے پیشی کے منکر اور مکذب تھے۔ دوسری چیز یہ کہ ان کو دنیا میں جو رفاہیت و خوشحالی حاصل ہوتی وہ ان کے لئے فتنہ بن گئی۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کی یہ دنیاوی کامیابی ان کے لئے عمل و عقیدہ کی صحت کی دلیل ہیں آخرت اول تو ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو جو کچھ ان کو یہاں حاصل ہے کوئی وجہ نہیں کہ وہ آخرت میں اس سے محروم ہو جائیں۔ اس دولت و رفاہیت کے سبب سے وہ اپنے اوپر کسی کی برتری تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے اور وہ بھی ایک ایسے شخص کی برتری جس کو ان کی طرح مال و جاہ حاصل نہیں تھا اپنے اس غرور پر انہوں نے یوں پردہ ڈالنے کی کوشش کی کہ اگر خدا کسی کو ہماری رہنمائی کے لئے بھیجنے والا ہی ہوتا تو کسی مافوق بشر ہستی کو بھیجتا۔ ہمارے ہی جیسے ایک بشر کو رسول بنانے کے کیا معنی!

سورۃ انبیاء میں فرمایا

بَلْ مَتَّعْنَا هَٰؤُلَاءِ وَآبَاءَهُمْ حَتَّىٰ
طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۗ أَفَلَا يَرَوْنَ
أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ
أَطْرَافِهَا ۚ أَفَهُمُ الْغَالِبُونَ ۝
(انبیاء ۴۴)

بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ہم نے ان کو اور ان کے باپ دادا کو دنیا سے بہرہ مند کیا یہاں تک کہ اسی حالت میں ان پر ایک طویل مدت گزر گئی۔ تاہم کیا وہ دیکھ نہیں رہے کہ ہم سرزمین مکہ کی طرف اس کے اطراف سے کم کرتے ہوئے بڑھ رہے ہیں تو کیا یہ لوگ غالب رہنے والے ہیں۔

یعنی ایک طویل مدت تک خدا کی نعمتوں سے بہرہ مند رہنے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان کے دل سخت

سیاہ ہو چکے ہیں۔ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ عزت و اقتدار ان کو جو حاصل ہے ان کے آباؤ اجداد کا ورثہ ہے۔ یہ اس کے موروثی مقدار ہیں۔ اسی میں وہ پیدا ہوئے ہیں۔ اسی میں عیش کریں گے اور اس کے وارث ان کے اخلاف ہوں گے۔ اس زعم باطل نے پیغمبر کے انذار سے ان کو بالکل بے پروا کر رکھا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ پیغمبر کی ساری تنبیہات محض ہوائی ہیں ان کے اقتدار کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا ایک طویل مدت تک خدا کی رحمت سے بہرہ مند رہنے کا نتیجہ ناشکروں پر قساوت قلب کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ سورہ حدید میں اس کا ذکر یوں ہوا ہے۔

وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا
الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ
الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ ۖ وَ
كَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ
(الحدید ۱۶)

اور ان لوگوں کی طرح بن کر نہ رہ جائیں جن کو اس سے پہلے کتاب دی گئی تو ان پر ایک طویل مدت گزر گئی اور ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے بہتیرے نافرمان ہیں۔

جھوٹی عزت نفس:

تکبر کا ایک اہم سبب بے جا پندار خودداری یا عزت نفس ہے اس میں اس شخص کا پندار اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی غلطی کو تسلیم کرنا اپنی توہین سمجھتا ہے اور حق کے آگے سر جھکانا یا اس کو مان لینا وہ کسی قیمت پر گوارا نہیں کرتا۔

سورۃ المنافقون میں فرمایا

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ
لَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ لَوَّوْا
رُءُوسَهُمْ وَرَأَيْتَهُمْ يَصُدُّونَ وَ
هُمْ مُسْتَكْبِرُونَ
(المنافقون ۵)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اللہ کا رسول تمہارے لئے استغفار کرے تو وہ اپنے سر مٹکاتے ہیں اور تم ان کو دیکھتے ہو کہ وہ غرور کے ساتھ اعراض کرتے ہیں۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ جن لوگوں کے اندر اخلاقی جرأت نہیں ہوتی اور جھوٹی عزت نفس میں مبتلا ہوتے ہیں وہ اپنے گناہوں کے ظاہر ہو جانے کے بعد بھی ان کا اعتراف یا اظہار ندامت نہیں کرتے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر ایک بار اعتراف جرم کر لیا تو ہمیشہ کے لئے بھرم کھل جائے گا۔ ان کی یہ کمزوری

ان کو ان کے گناہوں کے ساتھ باندھے رکھتی ہے۔

تکبر کے اثرات

شرک:

جو شخص استکبار میں مبتلا ہوجاتا ہے وہ اپنے آپ کو خدا سے بھی بڑا یا کم سے کم اس کا ہمسر ضرور سمجھ بیٹھتا ہے۔ حالانکہ کبریائی صرف خدا کے لئے زیبا ہے کیونکہ آسمان وزمین کی ہر چیز اللہ کی پیدا کردہ اور اسکی ملکیت ہے۔ کسی دوسرے کے لئے یہ زیبا نہیں ہے۔ اگر کوئی دوسرا تکبر کرتا ہے تو یہ بغیر حق ہے وہ اللہ تعالیٰ کی خاص ردا اپنے اوپر اوڑھنے کی جسارت کرتا ہے جو شرک ہے۔ اگر حق واضح بھی ہوجائے تب بھی ایسے لوگ اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے بلکہ وہ اس بات میں اپنی سبکی سمجھتے ہیں کہ قوم کے سردار اعیان واشراف ہو کر کسی ایسے شخص کی برتری اپنے اوپر تسلیم کریں جو دنیاوی وجاہت میں ان کا ہمسر نہ ہو۔

حق سے اعراض:

متکبرین اپنی پچھلی روایات اور مستقبل کے مفادات کے غلام بن جاتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں ان کی راہ میں اس طرح روک بن جاتی ہیں کہ ان سے ہٹ کر وہ کوئی چیز دیکھنے کے قابل ہی نہیں رہ جاتے اور اپنے پندار کی اوٹ میں انھیں بڑا سے بڑا حق بھی نظر نہیں آتا۔ وہ اپنے اندر ایک شخص کو رسول ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے اسی وجہ سے وہ قرآن کے وحی الٰہی ہونے کے منکر ہوتے ہیں اور قیامت کو بھی ایک بعید از قیاس چیز قرار دیتے ہیں۔ اگر وہ استکبار میں مبتلا نہ ہوتے تو وہ اتنے بلید نہیں ہیں کہ اللہ کے کلام اور کاہنوں کے خرافات میں امتیاز نہ کر سکیں اور قیامت کے اثبات کے جو دلائل قرآن ان کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ ان کے سمجھنے سے قاصر رہ جائیں۔ ان کی اس حالت کی تصویر سورہ یٰسین میں ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

إِنَّا جَعَلْنَا فِي أَعْنَاقِهِمْ أَغْلَالًا فَهِيَ إِلَى الْأَذْقَانِ فَهُم مُّقْمَحُونَ (یٰسین ۸)	ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں جو ان کی ٹھوڑیوں تک ہیں پس ان کے سر اٹھے رہ گئے۔

گویا ان کی گردنوں میں ایسے طوق پڑے ہوئے ہیں جو ان کی ٹھوڑیوں تک پہنچے ہیں جس کے سبب سے ان کے سر اس طرح اٹھے ہوئے رہ گئے ہیں کہ نہ وہ نیچے کی طرف جھک سکتے ہیں اور نہ ہی اوپر کی طرف اٹھ سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ وہ زمین کی نشانیوں کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ آسمان کے عجائبات پر نگاہ ڈال سکتے ہیں۔

حق کی مخالفت:

متکبرانہ ذہنیت صرف حق سے گریز پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ جب حق کی آواز لوگوں کے دلوں میں جگہ پیدا کرنا شروع کردیتی ہے تو حسد سے جل اٹھتے ہیں اور پھر اس کی مخالفت پر اتر آتے ہیں۔ مخالفت میں یہ بالکل عامیانہ حرکتیں کرتے ہیں کیونکہ ان کے پاس روشن دلائل کے جواب میں کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور داعیان حق پر پھبتیاں چست کرتے ہیں تاکہ عام لوگوں کو یہ تاثر دے سکیں کہ یہ لوگ جس کو حق کہہ رہے ہیں وہ کسی سنجیدہ غور و فکر کا مستحق نہیں۔

سورۃ القلم میں فرمایا

إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ (القلم ۱۵)	جب اس کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو اگلوں کے فسانے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو ان قوموں کی سرگزشتیں سنائی جاتی ہیں جو ان ہی کی طرح غرور و استکبار میں مبتلا ہوئیں اور اس کے نتیجہ میں تباہ کردی گئیں تو ان سے سبق لینے کے بجائے ان کا مذاق اڑاتے ہیں کہ یہ پچھلی قوموں کے فسانے ہیں۔ ان کو حاضر سے کیا تعلق۔ اس قسم کے نئے سنانے والوں کو ہم نبی ماننے کے لئے تیار ہیں اور نہ ان فسانوں سے ہم مرعوب ہی ہوتے

آخرت کا انکار:

متکبرین چونکہ اپنی بات کو ہی حق سمجھتے ہیں اور اپنے طرز عمل کے سوا دوسروں کے عمل کو خواہ وہ حق پر ہی کیوں نہ ہو باطل سمجھتے ہیں اس لیے وہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اپنی رفاہیت اور خوشحالی کو ڈھال بنا کر بڑے سے بڑے حق کو مسترد کر دیتے ہیں۔ اس لیے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ انہیں اپنے اعمال کی آخرت میں جواب دہی کرنا ہوگی تو یہ کہتے ہیں کہ جن چیزوں کو وہ آباء و اجداد کے زمانہ سے پوجتے اور کرتے چلے آرہے ہیں وہ کسی کے

کہنے پر کیسے چھوڑ دیں۔ گویا سوال ایک شے کے حق و باطل ہونے کا نہیں بلکہ اپنی آن بان کا ہے۔ ان کے اندر یہ غرور سمایا ہوا ہے کہ ایک چیز کتنی ہی باطل سہی لیکن جب وہ اس کو برابر کرتے آئے ہیں تو اس کو چھوڑ کر خود اپنے قول و عمل سے اپنے باطل پر ہونے کا اقرار کیوں کر لیں۔ اس طرح یہ آخرت کا انکار کر دیتے ہیں، اور خدا سے بے خوف ہو جاتے ہیں۔

اگر یہ لوگ آخرت کو مان بھی لیں تب بھی اس مغالطہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جب ان کو دنیا میں سیادت، قیادت اور رفاہیت اور خوشحالی حاصل ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ یہ چیزیں ان کو آخرت میں حاصل نہ ہوں۔ اس طرح یہ دنیا کو ایک دارالامتحان کی بجائے دارالانعام سمجھ بیٹھتے ہیں۔

غلو :

تکبر کے فتنہ میں مبتلا ہونے کے نتیجہ میں آدمی کا میلان غلو کی طرف ہو جاتا ہے۔ جو لوگ کسی چیز یا شخص کو مان لیتے ہیں وہ اگر حدود الٰہی سے واقف یا ان کو ملحوظ رکھنے والے نہ ہوں تو ان کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس چیز یا شخص کو سب چیزوں اور تمام اشخاص سے بڑھ کر ثابت کر دکھائیں پھر وہ اپنے استکبار کے اعتبار سے اس کو بڑھانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کو بڑھاتے بڑھاتے اس حد تک پہنچا دیتے ہیں جہاں پہنچ کر ان کے استکبار کو تسلی ہو جاتی ہے کہ اب برتری کے میدان میں کوئی ان کا حریف نہیں رہا اور کوئی ان کو چیلنج نہیں کر سکتا۔ عیسائیوں کو یہی فتنہ پیش آیا۔ انہوں نے جب حضرت عیسیٰؑ کو مانا تو صرف اتنے پر قانع نہیں رہ سکے کہ ان کو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول مانیں، انہوں نے خیال کیا کہ اللہ کے بندے اور رسول تو بہت سے ہیں اگر مسیحؑ بھی اللہ کے بندے اور رسول ہی ہیں تو پھر ان کا اور ان کے ماننے والوں کا امتیاز کیا ہوا؟ اس محرک نے جو کھلا ہوا استکبار ہے انہیں آمادہ کیا کہ وہ کھینچ تان کر ان کو شریک خدا ثابت کریں۔

اب مسلمان بھی اس فتنہ میں مبتلا نظر آتے ہیں وہ اپنے پیروں اور مرشدوں کے معاملہ میں اس حد تک غلو کرتے ہیں کہ ان کو رسولؐ سے بھی آگے بڑھا دیتے ہیں اور بعض نادان قسم کے لوگ رسولؐ کی شان میں اس قدر غلو کرتے ہیں کہ ان کے سامنے خدا بالکل بے بس نظر آتا ہے۔

متکبرین کا انجام

خدا کے مبغوض :

متکبرین کا یہ کردار کہ وہ اپنی سیادت و امارت اور رفاہیت کے پندار میں مبتلا ہو کر بڑے سے بڑے حق کو نہ صرف یہ کہ قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں بلکہ اس کا مذاق بھی اڑاتے ہیں اس کی وجہ سے وہ خدا کے مبغوض قرار پاتے ہیں۔ سورہ نحل میں متکبرین کا ذکر کرتے ہوئے اور یہ بیان کر کے کہ چونکہ آخرت پر ان لوگوں کا ایمان نہیں ہے اس لیے یہ بے خوف ہیں اور یہ اس امر میں ہتک محسوس کرتے ہیں کہ ان کے آباؤ اجداد کے زمانہ سے وہ جن چیزوں کو پوجتے آ رہے ہیں وہ ایک شخص کے کہنے پر چھوڑ رہے ہیں، فرمایا:

لاجرم ان اللہ یعلم ما یسرون وما یعلنون، انہ لایحب المستکبرین	لاریب خدا جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔ وہ تکبر کرنے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔

(نحل - ۲۳)

یعنی اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں استکبار کا خناس سمایا ہوا ہے۔ اس وجہ سے وہ ایک حق کو حق جانتے ہوئے جھٹلا رہے ہیں اور ایک باطل کو باطل جانتے ہوئے اس سے چمٹے ہوئے ہیں۔ اللہ ایسے مغروروں اور متکبروں کو دوست نہیں رکھتا یعنی ان کو مبغوض رکھتا ہے۔

ذلت و رسوائی :

متکبرین چونکہ اپنی ناک اونچی رکھنے کے لیے حق کی مخالفت کرتے ہیں اور اگر کسی کے اندر ناک اونچی رکھنے کا جنون پیدا ہو جائے تو وہ اس کی خاطر بڑے سے بڑے اور واضح سے واضح حق کو بھی جھٹلانے پر کمربستہ ہو جاتا ہے قرآن نے ان کے لیے ذلت و رسوائی کی خبر دی ہے۔ سورہ قلم میں ایک متکبر کا کردار بیان کر کے فرمایا: "سنسمہ علی الخرطوم" کہ ہم عنقریب اس کے ناکڑے پر ذلت کا داغ لگائیں گے جس کو سب دیکھیں گے۔ کفار مکہ درحقیقت اپنی ناک اونچی رکھنے کے خاطر ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کر رہے تھے اس لیے فرمایا کہ ان کے مقدر میں ذلت و رسوائی لکھی ہوئی ہے۔ یہ استکبار اور اس کی سزا کی بہترین تصویر ہے۔

عذاب جہنم :

اپنے پندار کی وجہ سے خدا رسول اور آخرت کا انکار کرنے والوں کے لیے ایک دن ایسا آئے گا کہ جہاں

انہیں ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان کے تمام ساتھی اور مددگار چھٹ جائیں گے یہ بالکل بے بس ہو جائیں گے اور آخرکار یہ لوگ دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔ سورہ نساء میں فرمایا:

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	پس جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے
فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ وَيَزِيدُهُمْ	ہوں گے تو ان کو تو ان کا پورا پورا اجر بھی دے گا
مِّنْ فَضْلِهِ ۚ وَأَمَّا الَّذِينَ اسْتَنْكَفُوا	اور اپنے فضل میں سے بھی ان کو مزید بخشے گا اور
وَاسْتَكْبَرُوا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا	جنہوں نے عار اور تکبر کیا ہوگا ان کو دردناک عذاب
أَلِيمًا ۙ وَلَا يَجِدُونَ لَهُمْ مِّنْ	دے گا وہ اللہ کے بالمقابل نہ کسی کو اپنا دوست
دُونِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا	پائیں گے نہ مددگار!

(نساء-۱۷۳)

سورہ قصص میں فرعون کے تکبر کا حوالہ دیتے ہوئے دنیا اور آخرت میں اس کے انجام کی خبر ان الفاظ میں دی ہے:

وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُودُهُ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ	اور اس نے اور اس کی فوجوں نے زمین میں ناحق
الْحَقِّ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ إِلَيْنَا لَا يُرْجَعُونَ	گھمنڈ کیا اور انہوں نے گمان کیا کہ ان کو ہماری
فَأَخَذْنٰهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذْنٰهُمْ	طرف لوٹنا نہیں ہے تو ہم نے اس کو اور اس
فِي الْيَمِّ ۖ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ	کی فوجوں کو پکڑا پس ان کو سمندر میں پھینک
عَاقِبَةُ الظّٰلِمِينَ ○ وَجَعَلْنٰهُمْ أَئِمَّةً	دیا تو دیکھو ظالموں کا انجام کیسا ہوا اور ہم نے ان
يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ ۖ وَيَوْمَ	کو دنیا میں جہنم کی طرف دعوت دینے والے پیشوا
الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُونَ ○ وَأَتْبَعْنٰهُمْ	بنایا اور قیامت کے دن ان کی کوئی مدد نہ ہوگی
فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ	اور اس دنیا میں ہم نے ان کے پیچھے لعنت
هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوحِينَ ○	لگا دی ہے اور قیامت کے دن وہی خوار ہونے
(القصص - ۲۸ : ۳۹ - ۴۲)	والوں میں سے ہوں گے۔

یعنی دنیا میں فرعون اور اس کی فوجوں کو ان کے استکبار کے جرم میں سمندر میں غرق کر دیا گیا اور قیامت کے روز ان کا حال یہ ہوگا کہ کسی طرف سے ان کی کوئی مدد نہیں ہوگی دنیا میں وہ جن کے امام و پیشوا بنے تھے وہ سب ان کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔

قرآن مجید کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مجرمین جب دوزخ کے باڑے میں اکٹھے کئے جائیں گے تو وہ

متکبرین پر الزام تراشی کریں گے کہ تمہاری وجہ سے ہم اس حالت میں پہنچے۔ یہ لوگ دنیا میں تو ایک دوسرے کے تابع اور متبوع 'لیڈر اور پیرو' ساتھی اور مددگار بنے رہے ایک دوسرے کے گن گاتے رہے اور جھنڈے اٹھائے پھرتے رہے۔ سلامی اور ایڈریس پیش کرتے رہے لیکن وہاں دوزخ میں آمنے سامنے ہوتے ہی ہر گروہ دوسرے پر لعنت کے ڈونگرے برسائے گا۔

استکبار کا حق صرف خدا کو ہے:

اس زمین و آسمان میں استکبار کا حق صرف اس کو حاصل ہے جس نے ان کو پیدا کیا اور ان کے نظام کو چلا رہا ہے۔ جن کو نہ ان کے خلق میں کوئی دخل اور نہ جن کا ان کے تدبیر و انتظام میں کوئی حصہ اگر کوئی قوم گروہ یا خود اس میں اکڑیں اور اپنی ملکیت کے مدعی بن کر اٹھیں تو یہ ان کی شامت کی دلیل ہے۔ اس قسم کے استکبار کو اس کائنات کا خالق زیادہ مہلت نہیں دیتا۔ اس زمین کے بادشاہ حقیقی کے حکم و قانون کے خلاف کوئی قانون اس میں جاری کرنا بھی استکبار بغیر الحق میں داخل ہے اور یہ ٹھیک ٹھیک اسوۂ فرعون کی پیروی ہے جیسا کہ سورہ قصص میں فرمایا:

وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُودُهُ فِي الْأَرْضِ	اور اس نے اور اس کی فوجوں نے زمین میں ناحق
بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ إِلَيْنَا	گھمنڈ کیا اور انہوں نے گمان کیا ان کو ہماری
لَا يُرْجَعُونَ ○	طرف لوٹنا نہیں ہے۔

(قصص - ۳۹)

جب اس ساری کائنات کا خداوند وہی ہے تو اصل مالک اور بادشاہ کے ہوتے آسمانوں یا زمین میں کسی دوسرے کی کبریائی اور بڑائی کے لیے گنجائش کہاں سے نکلی؟ پھر تو ساری کبریائی کا حقدار وہی ہوا سب کو اسی کے آگے سرنگندہ اور اسی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے۔

خلاصۂ بحث:

اس بحث سے معلوم ہوا ہے کہ تکبر ایک ایسی اخلاقی اور عقلی بیماری ہے جس میں مبتلا ہو کر انسان بڑے سے بڑے حق کا انکار کر بیٹھتا ہے اور دوسروں کو حقیر سمجھنے لگتا ہے۔ دنیا میں لوگوں کو جو عزت قیادت و سیادت، رفاہیت اور خوشحالی حاصل ہوتی ہے۔ اس کو وہ اپنا پیدائشی اور خاندانی حق سمجھ بیٹھتے ہیں یا اس کو اپنی قابلیت کا ثمر قرار دیتے ہیں اس بنا پر یہ لوگ اپنے آپ کو اتنی بڑی چیز سمجھنے لگتے

ہیں کہ ان کے لیے یہ باور کرنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے کہ جس بات کو وہ جانتے اور مانتے ہیں حق اس کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ ایسے لوگ دراصل اپنے آپ کو خدا کا ہمسر سمجھنے لگتے ہیں اور بالآخر ان کا ٹھکانہ جہنم ہوتا ہے۔

بقیہ : حکمتِ قرآن (۱)

لیے ہو۔ ذکر خدا کی محبت اور خشیت ہی کا نتیجہ ہوتا ہے کیونکہ بندہ اس چیز کو زیادہ یاد رکھتا ہے جس کو محبوب رکھتا ہو یا جس سے ڈرتا ہو۔ ذکر گویا دل میں چھپی ہوئی محبت یا خشیت سے آگاہ کرنے والی چیز ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے 'انہ لیغان علی قلبی حتی استغفر اللہ' (میرے دل پر حجاب آجاتا ہے تو میں اللہ سے استغفار کرتا ہوں)۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ حکمت اللہ تعالیٰ کا ایک عطیہ ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا معلم بتایا گیا ہے۔ کیونکہ آپ اس کے تقسیم کنندہ اور ذریعہ تھے، جیسا کہ فرمایا :

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ	تم جن کو چاہو، ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ
اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ	ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

(قصص ۲۸ : ۵۶)

اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ 'انما انا قاسم والمعطی ھو اللہ' (میں تو محض تقسیم کنندہ ہوں، عطا کرنے والا تو صرف اللہ ہے) قرآن مجید نے دوسری جگہ فرمایا:

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَن تُؤْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ	اور کسی شخص کے لیے ممکن نہیں کہ وہ ایمان لاسکے مگر
اللَّهِ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ	اللہ کے اذن سے۔ اور وہ گندگی لاد دیا کرتا ہے
لَا يَعْقِلُونَ	ان لوگوں پر جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

(یونس ۱۰ : ۱۰۰)

تالیفات امام حمید الدین فراہیؒ

	روپے پیسے
۱۔ مجموعہ تفاسیر فراہی :	۶۰ — ۰۰
۲۔ اقسام القرآن :	۵ — ۰۰
۳۔ ذبیح کون ہے ؟	۵ — ۰۰

تالیفات مولانا امین احسن اصلاحی

۱۔ تدبر قرآن : (مکمل سیٹ : ۹ جلد) :	۸۱۰ — ۰۰
" : فی جلد :	۹۰ — ۰۰
۲۔ مبادئ تدبر قرآن :	۱۶ — ۰۰
۳۔ اسلامی قانون کی تدوین :	۱۳ — ۰۰
۴۔ اسلامی ریاست :	۳۰ — ۰۰
۵۔ اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل :	۱۶ — ۰۰
۶۔ قرآن میں پردے کے احکام :	۳ — ۰۰
۷۔ تنقیدات :	۱۸ — ۰۰
۸۔ توضیحات :	۲۱ — ۰۰
۹۔ تزکیۂ نفس : جلد اول	۴۵ — ۰۰
: جلد دوم	(زیر طبع)
۱۰۔ اصولِ تدبر حدیث :	(")
۱۱۔ دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار :	(")
۱۲۔ اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام :	(")
۱۳۔ حقیقتِ شرک و توحید :	(")
۱۴۔ حقیقتِ نماز :	(")
۱۵۔ حقیقتِ تقویٰ :	(")

فاران فاؤنڈیشن

۱۲۲۔ فیروز پور روڈ، اچھرہ، لاہور ۱۶ (پاکستان) فون : ۴۱۰۸۴۹